Al-Qawārīr - Vol: 02, Issue: 01, Oct – Dec 2020

OPEN ACCESS
Al-Qawārīr
pISSN: 2709-4561
eISSN: 2709-457X
journal.al-qawarir.com

جدید ہندوستان میں مسلم خواتین کی سماجی و تعلیمی خدمات

(حقوق اسلام کے تناظر میں)

Social and Educational Services of Muslim women in modern India

(In the context of Islamic rights)

Dr. Zia Ud Din Falahi*
Assistant Professor: Dept. of Islamic Studies, Aligarh Muslim University, Aligarh, India.

Version of Record
Received: 22-Jun-20 **Accepted**: 27-Jul-20
Online/Print: 19-Dec-2020

ABSTRACT

اسلام نے خواتین کو تکریم انسانیت کا درجہ عطا کیا۔اس نے جس طرح معاشرے میں مردوں کو حقوق عطا کیے ہیں، اسی طرح خواتین کے حقوق کا بھی تحفظ کیا ہے۔ مردوزن کے حقوق میں اسلام نے عدل وقسط کو بنیاد بناتے ہوئے ان کے الگ الگ دائرے متعین کیے ہیں۔ پیش نظر مقالے میں خواتین کے حقوق سے بحث نہیں کی گئی ہے بلکہ اسلام کے عطا کردہ حقوق کی روشنی میں خواتین ہن کے ان سماجی، سیاسی، تعلیمی کارناموں کا تذکرہ کیا گیا جو ان حقوق کا ثمرہ اور نتیجہ ہے۔ ظاہر ہے کہ حقوق کی حصولیابی ہمیشہ نتائج وثمرات کی شکل میں تہذیب وتمدن کا حصہ بن جایا کرتی ہے اور یہ حق شناسی کا اعلیٰ مقام ومعیار بھی ہے۔ چنانچہ اس مقالے میں جدید ہندوستان کی چار خواتین: ۱-نواب سکندر بیگم (و:۱۸۶۸ء)، ۲-بیگم حضرت محل (۱۸۷۴ء-۱۸۲۰ء)، ۳-آبادی بیگم عرف بی اماں (۱۹۲۴ء-۱۸۵۲ء)، ۴-نواب سلطان جہاں بیگم (۱۹۳۰ء-۱۹۵۸ء) کی سماجی وسیاسی اور تعلیمی خدمات کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے۔اس مطالعے کے ذریعہ درج ذیل نکات سامنے آئے:

۱- دین وشریعت کے تحفظ اور ملک وملت کے مفادات کی فکر ان چاروں مسلم خواتین کو رہی۔ بیگم حضرت محل اور بی اماں نے حکومت برطانیہ کے مظالم کے خلاف ملک گیر احتجاجات میں حصہ لیا۔ پورے ملک میں مسلم وغیر مسلم عوام کو وطن عزیز کے تئیں قربانی دینے کے لیے تیار کیا۔ ضمیر فروش کے مقابلہ میں ایمانی جرأت کا اظہار پوری زندگی کیا۔ بیگم حضرت محل کے نیپال میں جاکر مہاجرت کی زندگی کو ترجیح دیا جب کہ بی اماں نے اپنے دو سپوتوں محمد علی اور شوکت علی کو قربان کر دیا۔

CC BY

۲- سکندر بیگم اور نواب سلطان جہاں بیگم نے حکومت برطانیہ سے سر سید کی مانند مصالحتی پالیسی اختیار کی اور اپنی دور اندیشی سے ملک و قوم کا اثاثہ محفوظ کیا۔ اور تعلیم، صحت اور رفاہ عامہ کے درجنوں سفیوں میں دار تحقیق دے کر اپنی اور اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ بھوپال کی نواب خواتین کی علماء نوازی، اور علم دوستی پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔

۳- تکثیری معاشرے میں مسلم اقلیت کو اکثریت کے ساتھ کس طرح کا رشتہ و برتاؤ رکھنا چاہیے۔ بی اماں کا کردار اس ضمن میں واضح تصورات عطا کرتا ہے۔ سماجی و تہذیبی اور ملی و قومی مفادات کا تحفظ ملک کے تمام باشندوں کو کس طرح کرنا چاہیے یہ مقالہ اس قصے کو بھی حل کرتا ہے۔

۴- بی اماں نے ثابت کر دیا کہ حجاب زندگی کی ترقی میں مانع نہیں ہے۔ عورت گھر اور باہر دونوں جگہوں پر باحجاب رہ کر اقدامات کر سکتی ہے۔ اماں کی شکل میں مردوں کو قربانیوں کے لیے آمادہ کر سکتی ہے جیسا کہ بی اماں نے تمام ہندوستانیوں کے ذہن و دماغ میں آزادی کے حصول کے لیے سیسہ پلائی دیوار کی مانند ہے۔

۵- بی اماں نے کانگریس اور خلافت تحریک کے ملک گیر اجتماعات میں صدارتی خطابات پیش کیے۔ ہندوؤں، سکھوں اور مسلمان نیز دیگر قوموں کے ساتھ ان کی مشارکت نے حلف الفضول کی سنت کا گویا گزشتہ صدی میں احیاء کیا۔ در حقیقت گاندھی جی کی مقبولیت میں بی اماں کا کردار نہایت اہم ہے اس طرح ہندوستان کی آزادی میں آبادی بیگم عرف بی اماں والدہ ماجدہ مولانا محمد شوکت علی و مولانا محمد جوہر علی کی قربانیاں سنہرے حرفوں میں کندہ کیے جانے کی مستحق ہیں، لیکن افسوس ہے کہ سیاسی مغلوبیت کے نتیجے میں مؤرخین نے ہندوستان کی مسلم خواتین کے شاہکار کردار کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔

امید ہے کہ یہ مقالہ خواتین ہندوستان کی سیاسی، سماجی، رفاہی، تعلیمی اور طبّی خدمات کا اسلامی پس منظر پیش کرے گا۔ اور ان گوشوں میں ان کی خدمات کو اسلام کے عطاو بخشش قرار دے گا۔ در حقیقت ہندوستان کی مسلم اقلیت کے اس کردار کو آج تک فراموش کیا جاتا رہا ہے۔ حتی کہ خود اہالیان دین متین، مسلم خواتین کی ان خدمات کے اعتراف میں تذبذب نظر آتے ہیں۔ آج کی اکیسویں صدی میں ضرورت ہے کہ اسلام کا دانشورانہ تعارف بھی حاصل کیا جائے اور روایتی قدروں کا تحفظ بھی کیا جائے۔ یہ مقالہ مردوں کو دعوت غور و فکر دیتا ہے کہ خواتین کی خدمات کا کھلے بندوں اعتراف کیا جائے۔

کلیدی الفاظ: جدید ہندوستان، تعلیمی اور سماجی خدمات، خواتین، خقوق، اسلامی تناظر

آدم و حوّا کی تخلیق کے بعد ہی ان کے امتحان کا آغاز ہو گیا اور اسی وقت سے انسانوں کے حقوق و فرائض کی بحث کی ابتدا بھی کر دی گئی۔ جنت میں دخول یا رضائے الٰہی کے حصول کو ابن آدم کا سب سے بڑا حق قرار دیا گیا۔ اس کے لیے سب سے بڑی ذمہ داری یہ قرار دی گئی کہ زمین پر خالق کائنات کی خلافت کو وہ قائم کرے۔ خلافت کے قیام کی یہ ذمہ داری مرد و خواتین پر ان کے فطری دائروں میں، قرآن نے یکساں ڈالی ہے۔ اور دونوں نے اس ذمہ داری کو قبول بھی کیا ہے۔ اس کی اعلیٰ شان یہ ہے کہ جن چند رسولوں اور نبیوں کا تذکرہ قرآن میں کیا گیا ہے ان میں متعدد خواتین کو بھی نبوت کا مقام بلند عطا ہوا ہے۔ چنانچہ ام اسماعیلؑ (سورہ ابراہیم ۱۴:۳۷)، ام اسحٰقؑ (سورہ ہود ۱۱:۷۱-۷۳)، ام موسیٰؑ (القصص ۲۸:۷-۱۳)، (سورہ طہٰ ۲۰:۳۸-۴۰، ۹۴) اور متعدد خواتین پر وحی کا آنا اور جبرئیل امین کا سلام پیش کرنا ان کے منصب نبوت کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے۔

عہد رسالت میں حقوق و فرائض کے عملی مظاہر بہت واضح اور نکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلاً حضرت خدیجہ کو جبرئیل کا سلام کرنا، متعدد خواتین کا اپنے شوہروں سے پہلے حلقہ بگوش اسلام ہونا، دار ارقم میں خواتین اسلام کی خفیہ خدمات و امداد، غزوات میں خواتین اسلام کی پیش قدمیاں اور جرأت مندانہ اقدامات نیز فروغ اسلام کے لیے رسالت مآب سے اخذ و استفادہ اور تبلیغ و اشاعت نیز

خرید وفروخت اور کسب معاش کی کوششیں وغیرہ ثابت کرتی ہیں کہ عہد نبوی میں اسلام نے خواتین کو برابر کے حقوق عطا کیے اور جہانِ نسواں نے ان حقوق کا اعتراف اپنی بے لوث خدمات کے ذریعہ عملاً پیش بھی کیا۔[1]

عہد رسالت مآب ﷺ میں خواتین کو جو دینی، سماجی، اقتصادی، سیاسی، اور تعلیمی حقوق عطا کیے گئے تھے، ان کا فطری اظہار انسانی آبادیوں میں خواتینِ اسلام کی طرف سے ان کی متنوع خدمات کی صورت میں ہوا ہے۔ احادیث وسیر اور تاریخ کی کتابوں نیز مفسرین ومحدثین کی بحثوں میں ان حقوق سے متعلق سے چشم کشا مواد فراہم ہوتا ہے۔ عالم عرب کے معروف دانشور شیخ ابوعبدالرحمٰن عبدالحلیم محمد ابوشقہ، معروف سیرت نگار پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی اور بر صغیر کے معتبر عالم دین مولانا سید جلال الدین عمری نے اس موضوع کو جدید مسائل کے ضمن میں حل کرنے کی کوشش کی ہے۔[2]

زیر بحث مقالے میں اصلاً یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان حقوق سے خواتین ہند نے کس قدر استفادہ کیا اور اپنی گوناگوں خدمات کی شکل میں ان حقوق کا اعتراف وادراک کس طرح کیا۔ سطور ذیل میں مذکورہ چار خواتین کی خدمات کا جائزہ لے کر یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام کے عطا کردہ حقوق کی روشنی میں ان خواتینِ بر صغیر نے اپنے زمانوں میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، ان کا ہندوستان کی سماجی اور تعلیمی ترقی میں کیا اثر نمایاں ہوا۔

جدید ہندوستان میں خواتین کی شراکت داری

ابتدائی بحث کے ذریعہ یہ بات ثابت کی گئی کہ اسلام نے خواتین کو آئینی ودستوری حقوق عطا کیے ہیں۔ اور عہد رسالت مآب ﷺ میں خواتین نے ان حقوق سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ بعد کے ادوار میں اسلام کی کرنیں جہاں جہاں پہنچیں، خواتین نے ان حقوق کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور اپنے ''فطری دائروں'' میں رہتے ہوئے اسلام کی خدمت بھی کی ہے۔ ''فطری'' کا لفظ مغربی مساواتِ مرد وزن کے سیاق میں استعمال کیا گیا ہے، جس کی حصولیابی کے لیے نام نہاد حقوق نسواں (Feminism) کی تحریک چلائی گئی۔ تحریکِ آزادی نسواں کے کڑوے کسیلے پھل کی بابت نو مسلمہ محترمہ مریم جمیلہ (و: ۲۰۱۲ء) نے یورپ میں رہ کر خود ان کی زبان میں عالمانہ مقالات ومحاضرات پیش کیے ہیں۔[3]

جدید ہندوستان میں مسلم خواتین کی ایک معتد بہ تعداد نے زندگی کے دیگر میدانوں کے علاوہ سیاسی انقلاب کی پشتیبانی بھی کی ہے۔ مثلاً ترکی کے مسلمانوں سے عقیدت کو مسلم عقیدہ کا حصہ بنانے کے لیے مولانا شوکت علی (و: ۱۹۳۸ء) اور مولانا محمد علی (و: ۱۹۳۱ء) کی والدہ ماجدہ آبادی بانو بیگم معروف بہ بی اماں (۱۹۲۴ء-۱۸۵۰ء) کا کارنامہ سرفہرست ہے۔ دوسری جانب اودھ کی مسلم ریاست کو انگریزوں کے چنگل سے بچانے کے لیے بیگم حضرت محل (و: ۱۸۷۴ء) کی مہمات اور قربانی قابل رشک وفخر ہے۔ تیسری طرف سماجی خدمات اور تعلیمی ماحول سازی، سوسائٹی کی معیار بندی اور اس کی آبیاری میں نواب سکندر بیگم اور نواب سلطان جہاں بیگم کے علاوہ دیگر خواتین نے ہندوستان کی جدید کاری اور تعمیر وترقی میں انقلابی مہمات سر کی ہیں۔[4]

درحقیقت خواتین کی سیاسی تگ وتاز کا بنیادی سہرا رضیہ سلطانہ (زمانہ حکمرانی: ۱۲۴۰-۱۲۳۶) کے سر جاتا ہے۔ جو سلطان التمش کی حقیقی جانشین ثابت ہوئیں۔ گلبدن بیگم (۱۶۰۳-۱۵۲۳ھ)، نور جہاں بیگم (۱۶۴۶-۱۵۷۷)، ممتاز محل (۱۶۳۱-۱۵۹۳)، جہاں آرا (۱۶۸۶-

۱۶۱۳)، روشن آرا بیگم، ۱۷۔۱۶۱۷-۱۶)، زیب النساء بیگم (۱۷۰۲-۱۶۳۸) وغیرہ کے کارہائے نمایاں بنیادی طور پر عہد مغلیہ کی سیاسی، سماجی، رفاہی اور تعلیمی صورت حال کا خوبصورت گلدستہ ہیں، جن کا جائزہ الگ سے لیا جانا چاہیے۔مقام حیرت ہے کہ معاصر تاریخی دستاویزات میں مذکورہ خواتین کی خدمات کا ذکر وچرچہ موجود ہونے کے باوجود جدید ہندوستان کے تاریخی لٹریچر اور اسکولی نصاب میں ان کا اعتراف نہیں کیا گیا ہے بلکہ نصاب میں ان کا تذکرہ منفی تصویر پیش کرتا ہے۔

۱-نواب سکندر بیگم(۱۸۶۸ء-۱۸۱۹ء)

سرزمین بھوپال کی متعدد نواب خواتین نے عہد برطانیہ کی مراعات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلم تہذیب وثقافت کے تحفظ کا قابل ذکر سامان کیا ہے۔ نواب سکندر بیگم بنت نواب نذر محمد خاں ان میں سے ایک ہیں۔ ان کی تعلیم وتربیت اسلامی ماحول میں ہوئی تھی۔ وہ خطاطی، گھڑسواری، حساب وریاضی، نشانہ بازی کی ماہر تھیں۔ فارسی زبان کے علاوہ اپنی خطابت میں بکثرت قرآنی آیات کا ذکر کرتی تھیں۔۵

نواب سکندر بیگم نے صوبہ بھوپال کی تمدنی زندگی میں بے شمار اصلاحات کیں۔ پولیس کا شعبہ، محکمہ قضا، آرمی، شہری آبادکاری، تعلیم اور صحتِ عامہ۔ سطور ذیل میں صرف تعلیم اور صحت کے شعبے میں ان کی خدمات کی ایک جھلک قارئین کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔

تعلیمی خدمات

نواب سکندر بیگم ریاست بھوپال میں معیاری تعلیمی ترقی کی خواہاں تھیں۔انھوں نے ''مدرسہ سلیمانیہ'' تعمیر کیا اس مدرسہ کا نام انھوں نے اپنی پوتی سلیمان جہاں بیگم کے نام پر رکھا۔اس مدرسے کے نصاب میں حساب، ناگری زبان اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کو بطور خاص اہمیت دی گئی۔ نواب صاحبہ نے نہ صرف تمام مشرقی زبانوں کو اہمیت دی بلکہ اردو زبان کو ریاست بھوپال کی سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا۔ دوسری طرف ان کا خیال تھا کہ اشراف کے درمیان کام کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انگریزی زبان کی اعلیٰ لیاقت پیدا کی جائے کیوں کہ دیگر فوائد کے علاوہ اس زبان کے ذریعہ حساب کی اعلیٰ صلاحیت بھی پروان چڑھتی ہے اور طلبہ وطالبات کے وارثین کی توقیر کا ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اس اسکول میں ایک عظیم لائبریری قائم کی گئی، جس میں وقت کے تقاضے کے مطابق کتابوں کا ذخیرہ جمع کیا گیا۔ یہ اسکول ہائی اسکول کی منزل کو عبور کرتا ہوا ۱۸۹۲ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے ملحق کر دیا گیا۔ نواب صاحبہ نے ہر پرگنہ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے اردو اور ہندی کے الگ الگ اسکول قائم کیے۔ وقت کے جید اساتذہ کو ان اسکولوں میں تقرری دی گئی۔ ایک دوسرا اسکول: وکٹوریا اسکول کے نام سے قائم ہوا جس کی نگرانی ایک خاتون زیب النساء کو عطا کی گئی۔ اس اسکول میں سونا، چاندی کے جھالر، سونا چاندی کی سوزن کاری (Embroidery) اور متعدد قسم کی ہندوستانی سوئی اور دھاگہ کے کام بچیوں کو سکھائے جاتے تاکہ طالبات وقت کے تقاضوں سے واقف ہوں اور اپنے روزگار کا مسئلہ کو خود حل کر سکیں۔ بیگم صاحبہ ہر ہفتہ اس اسکول میں ایک بار تفتیشی زیارت کرتی تھیں۔ نواب صاحبہ نے بے شمار اسکولوں کا جال پورے صوبے میں پھیلا دیا۔ ایک اندازے کے مطابق انھوں نے دس لاکھ روپے تعلیمی منصوبے پر خرچ کیے تاکہ عمارت، لائبریری اور کتابوں کا ذخیرہ مہیا کیا جا سکے۔ ۱۸۷۲ء کی ایک رپورٹ کہتی ہے کہ بھوپال میں

نواب سکندر بیگم کے عہد میں بارہ تا پندرہ فی صد آبادی تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو چکی تھی۔ ان کے عہد میں تقریباً ۴۸ (اڑتالیس) اسکول ریاست بھوپال میں معیاری تعلیم دے رہے تھے۔[۶]

۲۔ صحت عامہ

تعلیم کی مانند سکندر بیگم کو عوام کی اچھی صحت کی بھی فکر تھی۔ اسلام نے تعلیم اور صحت دونوں پر خصوصی توجہ دی ہے۔ چنانچہ اپنے پیش رو مسلم سلاطین و خلفاء کی پیروی میں بھوپال کی سربراہ اعلیٰ نے اپنی رعایا کی ہر طرح دستگیری کی۔ انھوں نے ۱۸۶۱ء میں اس ریاست میں ایلوپیتھی کا پہلا ہاسپٹیل قائم کیا۔ نواب سلطانہ جہاں بیگم نے اپنی دادی سکندر بیگم کی رفاہی خدمات کے متعلق لکھا ہے:

"نواب سکندر بیگم کو بھوپال کی تاریخ میں وہی مقام حاصل ہے جو ہندوستان کی تاریخ میں اکبر اعظم کو حاصل ہے"۔[۷]

خلاصہ یہ کہ نواب سکندر بیگم ایک دیندار خاتون تھیں۔ وہ سر سید احمد خاںؒ کی مانند حکومت برطانیہ کی وفادار تھیں۔ حکومتی اثاثوں کا انھوں نے تحفظ کیا۔ ذرائع کو عوام کی رفاہی، فلاحی، تعلیمی ترقی کے منصوبوں میں لگایا۔ انھوں نے سفر نامہ حجاز، تزک سکندری، آئین سکندر، دیوان شیریں جیسی اعلیٰ پائے کی تحریریں تیار کیں جن میں سے بیشتر خود ان کے پریس "مطبع سکندری" سے شائع ہوئیں۔ ان کی علم دوستی اور علماء نوازی کی وجہ سے بیرون ملک کے علاوہ خود اندرون ملک میں دہلی، لکھنؤ اور کانپور کے مشاہیر بھوپال تشریف لائے جن کے تعاون سے عربی، فارسی، اردو اور انگریزی زبانوں میں دینی و تمدنی کتابیں تصنیف کروائی گئیں۔ نواب سکندر بیگم کی علم دوستی، علماء نوازی اور عوام کی فلاح و بہبود کے بے شمار اقدامات اسلام کا وہ منظر نامہ پیش کرتے ہیں جو عہد عباسیہ کے مسلم خلفاء اور حکمرانوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ یہی وہ پس منظر ہے جسے ثابت کرنے کے لیے علامہ شبلی (و: ۱۹۱۴ء) کو المامون والغزالی تصنیف کرنا پڑی اور جن کا ذکر نہایت جذب و شوق سے انھوں نے اپنے مقالے "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" میں کیا ہے۔[۸]

۲۔ بیگم حضرت محل (محمدی بیگم) (۱۸۲۰ء-۱۸۷۴ء)

بیگم حضرت محل ہندوستان کی مایہ ناز خاتون اسلام ہیں۔ وطن کی آزادی ان کا نصب العین تھا۔ بیگم صاحبہ انگریزوں کے لیے شمشیرِ بُراں تھیں، وہ اپنے شوہر واجد علی شاہ (و: ۱۸۸۷ء) کے مقابلہ میں کئی پہلوؤں سے ممتاز و برتر تھیں۔ انگریزوں نے ہندوستان کی دولت و ثروت کا جس بے دردی سے استعمال کیا، لگان و محصول کے جو ظالمانہ قوانین وضع کیے۔ عیسائیت کی تبلیغی مشنریز کو جس تیزی سے مہمیز کیا، ریاستوں اور جاگیروں پر انھوں نے غاصبانہ قبضے اور ڈاکے ڈالے اور ۴؍ فروری ۱۸۵۶ء کو ریاست اودھ کا الحاق جس طرح گزشتہ صلح ناموں کو نظر انداز کرتے ہوئے کیا اور بالآخر واجد علی شاہ کو کلکتہ میں نظر بند کرکے بے دست و پا کر دیا تھا۔ ان تمام حوصلہ شکن اور ظالمانہ رویوں نے بالآخر دس مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے بغاوت کے شعلے بھڑکائے جسے انگریز مصنفین Mutiny (بغاوت) کا نام دیتے ہیں۔ یہی وہ پُرآشوب دور تھا جس میں فوجی افسروں اور شاہی خاندان کے معزز افراد کی درخواست پر بیگم حضرت محل نے آزادی کا علم بلند کیا اور ۵؍ جولائی ۱۸۵۷ء کو اپنے ۱۴؍ سالہ بیٹے بِرجیس قدر (۱۸۴۵ء-۱۸۹۳ء) کو تخت واجد پر متمکن کرنے میں معاون بنیں اور خود شیر خوار بیٹے کی سرپرستی کرتے ہوئے سرفروشی، حب الوطنی اور ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی کی مثال بن کر منظر عام پر آئیں۔ حضرت

محل کا یہی وہ وصف ہے جو اسلامیان ہندوستان میں انھیں ممتاز کرتا ہے اور بھارت کی مسلمان خواتین میں انھیں نمایاں مقام عطا کرتا ہے۔[9]

بیگم حضرت محل نے اپنی سیاسی بصیرت اور مجاہدانہ کردار سے قرن اول کی اسلامی خواتین کی یاد تازہ کردی جو میدان جنگ میں اپنے تدبر وفراست سے دشمنوں پر رعب طاری کرتی تھیں اور اپنی خداداد انتظامی تدابیر اور معاملہ فہمی سے دشمنوں کی چالوں کو زیر بھی کرتی تھیں۔ بیگم حضرت محل کی موجودگی میں ان کی رضا اور رغبت سے ان کے نوخیز ونوعمر بیٹے بَرجیُس قدر کے نام جو تاریخی اعلان نامہ جاری ہوا اس کے الفاظ یہ تھے:

''خَلق خدا کی، مُلک ولی کا، حکم بَرجیُس قدر کا''

بَرجیُس کے نام کا جو سکہ جاری کیا گیا اس پر یہ شعر کندہ کیا گیا:

نصاری پہ قہرِ خدائی ہوا　　　　جو اس سال سلطانِ لکھنو ہوا

خورشید مصطفیٰ رضوی نے اپنی کتاب: جنگ آزادی اٹھارہ سو ستاون، مکتبہ برہان اردو بازار دہلی، ۱۹۵۹ء، میں فرمانِ برجیس قدر، والی اودھ ۱۸۵۷ء کی مکمل عبارت نقل کی ہے۔ اس دستاویز کے بعض ضروری جملے ملاحظہ کریں:

> سب ہندو مسلمان یہ جانتے ہیں کہ چار چیزیں ہر ایک مانُس کو بہت پیاری ہیں۔ اول دین ودھرم۔ دوسرے عزت وآبرو۔ تیسرے جان اپنی واپنوں کی، چوتھے مال واسباب۔ یہ چار چیزیں علمداری ہندوستان میں بچی رہتی ہیں۔ اس علمداری میں کوئی دین ودھرم کو نہیں ٹوکتا ہے۔ ہر ایک مانُس اپنے دین ودھرم پر رہتا ہے۔ عزت وآبرو ہر ایک مانُس کی موافق اس کی درد کی رہی ہے--- اور انگریز لوگ ان چار چیزوں کے بَیری ہیں۔ دین اور دھرم ہندو مسلمان سب کا کھونا چاہتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ سب لوگ کرسشین ہوں، نصرانی بن جائیں، ان کے عمل سے ہزاروں لوگ کرسشین ہو گئے اور ہوتے جاتے ہیں۔ عزت وآبرو تمام اشراف کی اور چوہڑے چمار کی ان کے برابر ہے۔ بلکہ نواب اور راجہ کو کھنچوا بلاتے ہیں اور بے عزتی کرتے ہیں--- اس واسطے سب ہندو مسلمانوں کو جتایا جاتا ہے کہ بچانا دین ودھرم اور عزت وآبرو ناموس وجان اپنی واپنے لوگوں کی اور اپنے مال واسباب کا جس کو منظور ہو وہ انگریزوں سے لڑنے پر بالاتفاق فوج سرکار کے مستعد رہے اور ہر جگہ ان کے فریب میں نہ آئے۔ سرکار سے ان کی پرورش اور تخفیف ہوگی۔[10]

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ غالباً بیگم حضرت محل کے اندر انگریزوں کے خلاف وہی جذبہ کام کررہا تھا جو حضرت شاہ عبدالعزیز (و: ۱۸۲۴ء) کے فتویٰ میں نظر آتا ہے، جو انھوں نے ۱۸۱۰ء میں انگریزوں کے خلاف دیا تھا اور ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر بطور خاص مسلمانوں کو اسلامی جہاد کے لیے آمادہ کیا تھا اور اس دینی جذبے نے ۱۸۳۱ء میں تحریک شہیدین کو زندگی اور توانائی عطا کی تھی جن کی کوششوں کے طفیل بقول مولانا مسعود عالم ندوی عہد مغلیہ کے مکمل زوال کے بعد اسلامی حکومت عملاً برپا ہو گئی تھی۔[11]

حضرت محل امور سلطنت کو ایک مشاورتی کمیٹی کے ذریعہ حل کرتی تھیں۔ عام مجلسوں میں نیز میدان جنگ میں بنفس نفیس جاکر جوش بھرتیں، سپاہیوں کے حوصلوں کو جواں اور تازہ رکھنے کے لیے انعامات واکرامات سے نوازتیں۔ انگریزوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے

شہر لکھنؤ کے چاروں اطراف میں دیوار بنانے کے لیے انھوں نے پانچ لاکھ روپے منظور کیے۔ جنگی چال کے طور پر انڈین رجمنٹ کے افسروں سے طے کیا کہ پہلے وہ ہوائی فائر کریں گے اور پھر اچانک ان کا رخ انگریزوں کی طرف موڑ دیں گے۔ انھوں نے رانی لکشمی بائی (و:۱۸۵۸ء) کی مانند عورتوں کا فوجی دستہ تیار کیا تھا جو محلوں میں جا کر عورتوں کو تربیت دیتا تھا۔ انھوں نے جیسا کہ مولوی ذکاء اللہ نے لکھا ہے کہ گیارہ دنوں کی انتھک کوششوں کے ذریعے اودھ کو ایک آزاد ملک بنالیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پورے اودھ کے اندر حکومت برطانیہ کا ایک بھی حاکم موجود نہیں ہے۔ ۱۲؎

سقوط لکھنؤ کی داستان خونچکا کی بابت ڈبلیو ایچ رَسل، نامہ نگار خصوصی اخبار لندن ٹائمز نے مفصل معلومات فراہم کی ہیں، جنھیں سندر لال نے اپنی کتاب ''سن ستاون'' میں تفصیل سے نقل کیا ہے۔ ''دوزخی عذاب اور سزاؤں'' کے انتقام کے نتیجے میں مسلمان جب انگریز قیدیوں کی طلب میں حضرت محل کے پاس ان کے محل میں آئے تو انھوں نے مردوں کو تو حوالے کر دیا لیکن انگریز عورتوں کو ان کے حوالے کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اور ان انگریز قیدی عورتوں کو محل کے زنان خانے میں بحفاظت رکھا۔ بیگم کے اس جنگی اقدام سے اسلام کا قانون جنگ نمایاں ہوا، جس کے اچھے اثرات ان خواتین نے یقینا قبول کیے ہوں گے۔ ۱۹؍مارچ ۱۸۵۸ء کو لکھنؤ کی لڑائی ملازمین کی نمک حرامی، تعلق داروں کی پسپائی، مہاراجہ پال کرشن کے انگریزوں کے ساتھ ساز باز کرنے اور وزیر اعظم نیپال کے کالن کیمپل اور جنرل اوٹرم کا ساتھ دینے جیسے واقعات نے جنگ کو بالکل بے جان کر دیا۔ اس موقع پر مارش مین نے اعتراف کیا ہے کہ انگریزی فوج کو دہلی میں بھی باغیوں کی مقاومت سے اس طرح سابقہ پیش نہیں آیا تھا جس طرح لکھنؤ کی اس مستعد اور سرگرم عورت کی وجہ سے پیش آیا۔ باغیوں کا جوش اودھ کی بیگم کی وجہ سے تھا۔ ۱۳؎

حضرت محل کی اولوالعزمی اور غیرت وحمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دورانِ جنگ جنرل اوٹرم نے تین شرطیں پیش کیں، جنہیں بیگم حضرت محل نے ٹھکرادیا۔ پہلی پیش کش یہ تھی کہ ممالک محروسہ سرکار سے موافق عہد دولت نواب شجاع الدولہ ملے گا بشرطیکہ لڑائی موقوف کر دی جائے۔ دوسری شرط یہ تھی کہ ہم زمانہ واجد علی شاہ کا بدستور تمہارا ملک دیں گے، جنگ سے دست بردار ہو جایئے۔ فوج مغلوبہ کے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔ تیسری اور آخری شرط یہ تھی کہ صرف ۲۵ ہزار روپے ماہانہ ملیں گے۔ جرأت مند اور حمیت اسلامی کی پاسبان خاتون نے ذلت کے ان شرائط پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ۱۴؎

سقوط لکھنؤ کے بعد ملکہ وکٹوریہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمرانی ختم کرکے ہندوستان کا نظم ونسق براہ راست تاج برطانیہ کے تحت لے لیا اور یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو الٰہ آباد کے مقام پر ایک پُرشکوہ دربار میں ملکہ وکٹوریہ کا جو فرمان پڑھا گیا، اس میں مکروفریب کے ذریعہ ہندوستانیوں کو بے وقوف بناکر ملکہ وکٹوریہ کا نمک خوار اور وفادار بننے کی عمومی اپیل کی گئی تھی۔ جب حضرت محل نے دیکھا کہ ہندوستان کے تمام لیڈران خاموش ہیں، تو انھوں نے اپنی فرودگاہ بونڈی سے اس فرمان کو چیلنج کیا۔ ان کے استدراک ومحاکمہ کا خلاصہ ان لفظوں میں بیان کیا جاسکتا ہے:

یکم نومبر ۱۸۵۸ء کے فرمان میں لکھا گیا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستانیوں کی خطائیں معاف کر دی ہیں --- ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہماری رعایا ہوشیار ہو جائے۔ انگریزوں نے کبھی کسی کا قصور چھوٹا یا بڑا معاف نہیں کیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ملکہ نے لکھا ہے کہ اب

تک جو کچھ کمپنی کے سپرد تھا وہ اب ملکہ نے اپنے ذمے لے لیا ہے--- ہماری حق شناس رعایا کو اس پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ کمپنی کے قانون، کمپنی کے انگریز ملازم، کمپنی کے گورنر جنرل اور کمپنی کی عدالتیں سب جیوں کی تیوں بنی رہیں گی تو پھر یہ نئی بات کونسی ہوئی کہ جس پر اعتبار کیا جائے۔ حضرت محل کہتی ہیں کہ اعلان میں یہ بھی لکھا ہے کہ کمپنی نے جو وعدے اور عہد و پیمان کیے تھے انھیں وہ منظور کرے گی۔ حالاں کہ ہمارے ساتھ صلح (معاہدہ ۱۸۰۱ء) کی خلاف ورزی کی گئی ہے نیز قسموں اور عہد ناموں کو توڑ کر ہم لوگوں سے کروڑوں روپے اور ہمارا ملک ہم سے چھین لیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ہماری رعایا ہم سے خوش نہیں ہے اور ہمارا انتظام اچھا نہیں ہے۔ حالاں کہ رعایا نے اپنی جس وفاداری کا ثبوت دیا ہے اس کی نظیر مشکل سے مل سکتی ہے۔ اعلان میں یہ کہا گیا ہے کہ ان کو اپنی مملکت کی حدود بڑھانے کی خواہش نہیں ہے لیکن دوسری جانب الحاق کا عمل جاری ہے۔ اعلان میں یہ بھی مذکور ہے کہ عیسائی مذہب برحق ہے لیکن کسی دوسرے مذہب کے ساتھ ناانصافی نہیں کی جائے گی اور سب کے ساتھ یکساں انصاف ہوگا۔ حضرت محل سوال قائم کرتی ہیں کہ عدالتِ گستری میں کسی مذہب کے برحق یا باطل ہونے سے کیا بحث ہے؟ کہتی ہیں کہ مذہب وہی برحق ہے جو ایک خدا کو تسلیم کرتا ہے اور اس ایک کے علاوہ کسی کو نہ مانے اور جب کسی مذہب میں تین خدا ہوں تو صرف ہندو اور مسلمان بلکہ یہودی اور وہ بھی جو سورج اور آگ کی پوجا کرتے ہیں اس کو صحیح تسلیم نہیں کر سکتے۔ سور کھانا، شراب پینا، سور کی چربی لگے کارتوسوں کو کاٹنا، آٹے اور مٹھائی میں سور کی چربی ملانا، راستہ بنانے کے بہانے ہندوؤں اور مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو منہدم کرنا، گرجے بنانا، عیسائی مذہب کی تبلیغ کے لیے گلی کوچوں میں عیسائی راہبوں کو بھیجنا، انگریزی اسکول قائم کرنا، لوگوں کو روپے کی طرح دے کر اپنی مذہبی باتیں سکھانا۔ جب کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے معبد کا آج تک کوئی پرسان حال نہیں۔ ان سب کے ہوتے ہوئے یہ کیوں کر اعتبار کریں کہ ان کا دین محفوظ رہے گا--- ہماری رعایا پر افسوس ہے۔ اب ہم صاف اعلان کرتے ہیں یکم جنوری ۱۸۵۹ء سے پہلے ہمارے کیمپ میں حاضر ہوں ان کا قصور معاف کیا جائے گا اور ان کی لیاقت کے مطابق اعزاز عطا ہوگا۔ ۱۵

خلاصہ یہ کہ حضرت محل نے شکست کھانے کے بعد گورکھوں کی سرزمین نیپال میں مہاجرت کی زندگی گزارنا پسند کیا۔ انھوں نے پینشن اور شاہانہ اعزازات نہ خود قبول کیا، نہ ہندوستان میں رہنا پسند کیا اور نہ اپنے بیٹے برجیس قدر کو انگریزوں کے حوالہ کرنے پر راضی ہوئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بیگماتِ اودھ نے ایک طرف ہندو مسلم اتحاد کی بے مثال تاریخ رقم کی اور اولوالعزمی و بہادری کی سوغات، جہانِ نسواں کو دے گئیں۔ بیگم حضرت محل کی تعریف ان کے سب سے بڑے دشمن کے نمائندے سر ڈبلیو ایچ رَسل نے ان الفاظ میں کی:

''بیگم میں بڑی قابلیت اور طاقت دکھائی دیتی ہے۔ بیگم نے ہم سے لامتناہی جنگ کرتے رہنے کا اعلان کر دیا ہے۔ ان رانیوں اور بیگمات کی ہمت اور طاقت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ زنان خانے کے اندر رہ کر بھی یہ کافی عملی اور دماغی طاقت اپنے اندر پیدا کر لیتی ہیں''۔ ۱۶

۳-آبادی بانو بیگم - معروف بہ بی اماں (۱۹۲۴ء-۱۸۵۰ء)

برصغیر کی تاریخ میں بیسویں صدی کی دوسری دہائی، ایمان راسخ، حب الوطنی، قومی یکجہتی، حق گوئی، آزادی ضمیر اور وسعتِ فکر و نظر کی تاریخ ہے۔ ان صفات کی حامل جس معمر خاتونِ ہند کو کاروانِ حریت نے ''اُمّ الاحرار'' کا خطاب عطا کیا۔ اور پیار و محبت سے ساکنان ہند

نے "بی اماں" کہہ کر پکارا، وہ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کی والدہ ماجدہ تھیں۔ ۲۷ سال کی جس کم عمری ہیں وہ بیوہ ہوئیں، اس وقت وہ چھ بچوں کی کفالت وتربیت کی امین بھی تھیں۔ خود چوں کہ بی اماں کی تربیت دینی ماحول میں ہوئی تھی، اس لیے انھوں نے اپنے بچوں کو بھی دین وملت کا سپاہی بنایا۔ خلافت تحریک کے زمانے میں ہندوستان کی آزادی کے لیے بی امام کا نام بطور استعارہ استعمال کیا جاتا تھا۔ ۱۷

سطور ذیل میں بی اماں کے خطوط، محمد علی کی یادداشتوں، معاصرین اور دیگر مستند حوالوں کی روشنی میں برصغیر کی بہادر ومدبر خاتون کی دینی و سیاسی خدمات کا ایک مختصر خاکہ تیار کیا گیا ہے۔ اس تفصیل سے جہاں وطن کی آزادی کے لیے ایک مومنہ کی ایمانی شجاعت واولوالعزمی پر روشنی پڑے گی، وہیں اس تاریخی حقیقت کا بھی اعادہ ہوگا کہ خواتین کی شرکت نے ہندوستان کی آزادی میں موثر کردار ادا کیا ہے۔ یہ وہ کردار ہے جس نے قومی ووطنی یکجہتی کو خالص دین وعقیدہ کی آنچ سے سرسبز وشاداب بنایا نیز برادرانِ وطن کے ساتھ مل کر قربانی کی جو مثالیں پیش کیں، انھوں نے جدید ہندوستان ہیں بعثت نبوی سے قبل کی اسوہ محمدی "حلف الفضول" کو تقویت بخش دی ہے اور نبوت کے بعد جس کی بابت آپؐ کہا کرتے تھے کہ آج بھی اگر موقع ملے تو وہ اس پر عمل پیرا ہوں گے۔

۱۔ انیسویں صدی کے مسلم معاشرے میں روایتی برقع/پردے میں رہ کر بی اماں نے نہ صرف اپنے بچوں کی دینی پرورش کی، ان کی موروثی املاک کی حفاظت کی بلکہ پورے ہندوستان کے ہندوؤں، مسلمانوں اور دیگر فرقوں کی ماں بن کر ان کی نگرانی اور رہنمائی کی۔ انھوں نے اپنے زمانے کے عام دینی مزاج میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا کردی۔ انھوں نے قدامت پسند دینی رجحان کی اصلاح کی اور بتایا کہ عورت کا مقام صرف گھر کی چہار دیواری نہیں ہے، وہ برقع اور پردہ کے ساتھ ایوان سیاست میں زلزلہ بھی پیدا کرسکتی ہیں۔ انھوں نے پردے کے رجعت پسندانہ تصور کی نکیر کی اور ثابت کردکھایا کہ حجاب/پردہ/برقع شاہراہ ترقی میں قطعاً مانع نہیں ہے۔ وہ اپنے ایک مکتوب میں اپنے پردے کی بابت ایک واقعہ نقل کرتی ہیں:

---۷، ستمبر (۱۹۱۷ء) کی صبح میں مسٹر عبدالحمید ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ محکمہ خفیہ جو شملہ سے میرے دونوں بیٹوں کے پاس آئے اور آئندہ زمانہ جنگ میں تاج برطانیہ کے خلاف ہر اقدام سے محترض رہنے کی دستاویز پر دستخط کروانے جارہے تھے۔ تو میں برقع اوڑھ کر اسی کمرہ میں آکر بیٹھ گئی جہاں مسٹر عبدالحمید سے گفتگو ہورہی تھی--- میں نے ان کو ان الفاظ میں مخاطب کیا---آپ گورنمنٹ سے کہہ دیں کہ میرا ایک فرض ان کے ذمہ ہے جو تمام فرائض سے مقدم ہے، جو دوسروں کے ان کے ذمہ ہوں۔ کیوں کہ میں نے نو مہینے ان کو پیٹ میں رکھا، ان کی ابتدائی عمر میں ان کو دودھ پلایا اور ہمارے رسول اکرم ﷺ نے ان کو بتایا کہ ان کی جنت میرے قدموں کے نیچے ہے۔ اپنی طویل جلاوطنی اور نظربندی کے زمانے میں انھوں نے جتنی تکلیف اٹھائی ہے، ان سے بخوبی آگاہ ہونے کے باعث یہ بھی سمجھتی ہوں کہ ان کے لیے کسی ایسی شرط کو مسترد کردینا کیسا سخت ہوگا، جن کے قبول کرنے میں زمانہ دراز کی ان تمام صعوبات کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ لیکن میں یہ چاہتی ہوں کہ گورنمنٹ یہ جان لے کہ اگر اپنی تکالیف سے بچنے کے لیے وہ کسی ایسی بات پر اقرار کریں گے جو ان کے مذہبی احکام یا ملکی فوائد کے ذرا بھی خلاف ہو تو مجھے یقین ہے کہ اللہ پاک میرے قلب کو اتنی مضبوطی اور ان سوکھے جھرّیاں پڑے ہاتھوں میں اتنی طاقت دے گا کہ میں اسی وقت ان دونوں کا گلا گھونٹ دوں گی، گو یہ مجھے بہت عزیز ہیں اور طاقتور اور لحیم و شحیم دکھائی

دیتے ہیں---اس کے بعد میں اپنے کمرے میں چلے آنے کو تھی کہ دونوں بیٹوں نے مجھے روکا اور جو خط بذریعہ تار سر چارلس کلیولینڈ کو بھیجا جانے والا تھا اس کا ترجمہ کرکے سنایا--- میرے بیٹوں نے اپنی پوزیشن کا یہ جو بیان دیا ہے اس نے کامل طور سے مجھے اطمینان دلا دیا ہے اور میں خیال کرتی ہوں کہ ہر شخص کو یہ مطمئن کرے گا۔۱۸

ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین تبصرہ کرتی ہیں:

> ''آزادی ایک نعمت ہے جس کے حصول کی خاطر انسان سبھی کچھ کر گزرتا ہے۔ اس نازک مرحلے میں بڑے بڑے قوی ہیکل مردوں کے قدم لڑکھڑائے لیکن سرکاری مخبر کی موجودگی میں مجاہد بیٹوں کی اس عظیم ماں نے جس ثابت قدمی اور فقید المثال جرأت مندی کا ثبوت دیا وہ ان کے ایمان راسخ اور غیر متزلزل عزم کی روشن مثال ہے۔ ام الاحرار کا یہ بیان ایک ضعیف مجاہدہ آزادی کی عظمت اور کردار کی بلندی کا نا قابل فراموش یادگار ہے''۔۱۹

۲۔ ایک دوسرا طویل اقتباس جو بی اماں نے اپنی مشفقہ دوست مسز اینی بسنت (و: ۱۹۳۳ء) کو چھنڈواڑہ (ممالکِ متوسط) سے ۱۱ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو رقم کیا تھا، نہ صرف یہ کہ اسلامی تاریخ میں عزم وثبات، صبر وشکر اور تدبر وفراست کی یاد تازہ کر دیتا ہے، بلکہ بی اماں کی شش جہات شخصیت کے متعدد پرت بھی کھولتا ہے۔ ذیل میں اس خط کی چند جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں:

خط کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوا ہے۔ ابتداء میں احسان شناسی کے لیے دل کھول کر اس بات کا اعتراف کہ محترمہ مسز اینی بسنت نے ان کے دونوں بیٹوں کی رہائی کے لیے ہز ایکسیلنسی وائسرائے سے ملاقات کی خاطر دور افتادہ اور صعوبتوں سے بھرا سفر کیا۔

وہ لکھتی ہیں:

> ''میں رسماً نہیں بلکہ تہہ دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کی کوشش زیادہ کامیاب نہیں ہوئی لیکن اس کا اثر آپ کے اس بار احسان پر نہیں پڑتا۔ جو ہم پر ہے۔ نہ اس سے کوئی تبدیلی اس عقیدے میں پیدا ہوئی ہے کہ انجام کار فتح ہماری ہوگی--- ہم نے اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دیا ہے اور اس کی حفاظت میں دے دیا ہے۔ ہمیں ایسی بڑی اُمید کا سہارا ہے جسے کوئی مایوسی توڑ نہیں سکتی، نہ دور کر سکتی ہے، مایوسی بے دینی اور بد اعتقادی سے پیدا ہوتی ہے جن کا کہ ہم وہم وگمان بھی نہیں کر سکتے--- کوئی مسلمان حقیقی معنوں میں مسلمان نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ وہ ٹرکی کے ساتھ ویسے ہی ہمدردی کا آزادانہ اظہار نہ کرے اور اس ہمدردی کی تبلیغ کے لیے کوشاں نہ ہو جیسا کہ وہ مسلمانانِ ایران، ہندوستان وعربستان کے ساتھ کرتا ہے--- میں فخر کرتی ہوں کہ گزشتہ سات سال کے عرصہ میں جہاں کہیں اور جب کبھی مسلمانوں کو مصائب میں مبتلا دیکھا یا سنا، میرے بیٹوں نے اس درد کو محسوس کیا اور ان کے ساتھ رنج میں شریک ہوئے---اس لیے کہ سب کے سب مسلمان تھے اور کلام مجید کی تعلیم کے مطابق وہ سب یکساں ہمدردی کے مستحق تھے۔--اعلیٰ حضرت سلطان ٹرکی کی ایک مخصوص حالت ہے--- یہ امتیاز ان اختیارات، مرتبہ اور عظمت کی وجہ سے ہے جو خلافت کے ساتھ وابستہ ہے۔ سلطان المعظم خلیفۃ الرسول یعنی پیغمبر خدا ﷺ کے جانشین اور امیر المومنین ہیں--- میں دوبارہ اس امر پر زور دیتی ہوں کہ مسلمانانِ ٹرکی کے ساتھ ہمدردی اور ان کے حکمراں کو مذہبی پیشوا ماننا کوئی سیاسی عقیدہ نہیں ہے--- یہ ہمارا مسئلہ ہے جو ہمارے مذہب کی روح سمجھا جاتا ہے ان کے حدود بھی مذہب میں سختی کے ساتھ

قائم کیے گئے ہیں جس طرح کے دوسرے مسائل میں۔ میں نہ کوئی مذہبی عالمہ ہوں نہ میرے لڑکے عالم دین ہیں۔ ہم لوگ اس مسئلے میں بھی مثل دوسرے دینی مسائل کے پیشوایان دین کی رہنمائی پر کاربند ہوتے ہیں---کچھ عرصہ ہوا کہ صوبہ متوسط کے چیف کمشنر نے شوکت علی کو ایسی دعا مانگنے سے روکا تھا چنانچہ ان دعاؤں کی نسبت جب مذہبی احکام ان کے سامنے پیش کیے گئے تب وہ حکم امتناعی منسوخ کر دیا گیا۔ اگر میرے بیٹوں نے (اس کے علاوہ) کوئی دوسرا طریقہ ہمدردی کا اختیار کیا تو صاف طور سے اس کا اظہار کیوں نہیں کیا گیا۔ ہم کو مسلمانان ٹرکی سے جو ہمدردی اور سلطان ٹرکی سے جو روحانی عقیدت ہے وہ ہمارے ناقابل تغیر مذہب کا ایک لازمی وضروری جزو ہے جس میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں! ---ہماری وفاداری دنیاوی بادشاہ کے ساتھ خواہ وہ مسلمان ہو یا عیسائی، یا ہندو، ہماری کامل مذہبی آزادی کے ساتھ مشروط ہے اور خدا سے ڈرنے والے مسلمانوں کی حیثیت سے ہم دنیا کے کسی حکمراں کے لیے ایسے احکام کی تعمیل نہیں کر سکتے جو احکم الحاکمین کے احکام کے خلاف نافذ کیے جائیں۔ اس لیے کہ خدا کی اطاعت تمام اطاعتوں پر مقدم ہے خواہ وہ اطاعت بادشاہ کی ہو، ملک کی ہو، باپ کی ہو یا ماں کی، بھائی کی ہو یا احباب کی۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ میرے لڑکوں نے کبھی اپنے مذہبی عقائد کو پوشیدہ رکھا ہے۔ نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے عقائد دیگر مسلمانان ہند کے عقائد سے مختلف ہیں۔ اس لیے کہ تمام مسلمانانِ ہند بالاعلان کہہ رہے ہیں کہ جو محمد علی اور شوکت علی کا عقیدہ ہے وہی ہمارا بھی عقیدہ ہے۔ اس لیے ہم سب بھی اگر ان سے زیادہ نہیں تو ان سے کم نظر بندی کے سزاوار نہیں---"۔

اسی خط میں نظر بندوں اور ان کے متعلقین کی امداد سے متعلق تفصیلی کلام کرتی ہوئی کہتی ہیں کہ حکومت نے اس پر ان کو آزادی سے محروم کر رکھا ہے، جو اپنے بال بچوں کے لیے کچھ کما نہیں سکتے، ان کی حکومت کو کچھ پرواہ نہیں ہے، چنانچہ متعدد لوگ فاقہ کشی کی وجہ سے خودکشی تک کر رہے ہیں۔ ایک باضابطہ دستاویزی رپورٹ تیار کرنے پر زور دیتی ہیں تاکہ ہزاروں لاکھوں قیدیوں کی فہرست تیار کی جاسکے، حکومت سے ان کے ماضی کے وظائف کی تفصیل کا علم ہوسکے، تاکہ ان کے بچوں کی تعلیم کا بندوبست ہو۔ اس خط میں شاہ آباد، گیا اور پٹنہ کے اضلاع میں عیدالاضحیٰ کے موقع پر دلخراش فساد کا ذکر ہے اور مذہبی تعصب کے نتیجے میں مسلمان مردوں کے ذہنوں میں جو یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ مسلمان عورت صرف اسکول اور کالج ہی میں جاکر تعلیم حاصل کر سکتی ورنہ وہ جاہل محض کہلانے کی مستحق ہے۔ بی اماں گویا اپنی مثال دے کر ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ تعلیم گھر پر رہ کر بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔[۲۰]

۳۔ کلکتہ میں کانگریس کا دوسرا اجلاس ۲۸؍دسمبر ۱۹۱۷ء میں بی اماں کی موجودگی میں ہوا۔ اس میں بال گنگا دھر تلک (و: ۱۹۲۰ء) نے کہا:

محمد علی و شوکت علی کو چھوڑ دیا جائے یا حکومت مقدمہ چلائے۔ گورنمنٹ کو آئینت کے تابع ہونا چاہیے۔ یہ وقت عجیب ہے کہ اس ریزولیوشن کو ہم ان کی والدہ کی موجودگی میں پاس کر رہے ہیں۔ بہادر بچوں کی والدہ ہونے کا جو اعزاز انھیں حاصل ہے، وہ بہت باوقعت ہے۔ اس وقت ہم جو کچھ کہنا چاہتے وہ یہ ہے کہ آپ اس سختی کو بھول جائیں جو گورنمنٹ نے آپ کے بچوں کے ساتھ کی ہے۔ ہم سب کو آپ سے ہمدردی ہے اور میں دعا کرتا ہوں کہ ملک ایسی بہت سی بہادر مائیں پیدا کرے---"۔

مسٹر ایس ایس سیتا مورتی نے ریزولیوشن کی حمایت کرتے ہوئے کہا:

''ہندو شاستروں میں لکھا ہے کہ قومیں دولت اور روپے سے سربلند اور سرتاج نہیں ہوتیں بلکہ اپنی قربانیوں سے، وہ قربانی جو حق وصداقت کے لیے ہو۔ نظربند علی برادران نے قربانی کی ہے اور ملک نہ صرف ان کی سامنے خراج وفاداری اور اطاعت پیش کرتا ہے بلکہ وہ ان کی والدہ کے سامنے بھی سرنیاز ختم کرتا ہے۔۲۱

۴۔ ام الاحرار ایک ہی وقت میں آل انڈیا کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے قائدین میں شمار کی جاتی تھیں۔ دونوں کے ملکی و قومی اجتماعات میں یہ بزرگ ضعیفہ محور فکر و نظر ہوا کرتی تھیں۔ ۳۰؍دسمبر ۱۹۱۷ء کو مسلم لیگ کے ساتھ اجلاس میں ملکہ حریت کا پیغام مسلمانان ہند کے نام پڑھا گیا۔ اس خطبہ کو انھوں نے اپنی زندگی کا آخری خطبہ قرار دیتے ہوئے مسلمانانِ ہند کو کلمہ لاالہ الا اللہ کی قدر کرنے، عالمی اخوت کا تحفظ کرنے اور ترک سے محبت کرنے کے دینی رویے پر نہایت بصیرت افروز خطبہ پیش کیا تھا۔ چند اقتباسات اور فقرے آپ بھی سماعت کریں:

مسلمانان ہندوستان کی تاریخ میں آج کا واقعہ ایک یادگار واقعہ ہوگا۔ اس لیے نہیں کہ ایک ضعیف العمر عورت غریب الوطنی کی چادر اوڑھ کر آپ کے روبرو آئی ہے، نہ اس لیے کہ آوارۂ وطن ہو کر اور چھنڈواڑہ کی کوٹھی سے نکل کر میں آپ کے پاس کوئی فریاد لے کر آئی ہوں۔ اگر میں محض اپنے بچوں کی عافیت وخیریت کی طلب گار ہو کر آئی ہوتی یا حکومت کے مظالم کی فریاد لے کر آتی یا ان مصائب کی داستان سناتی جو ہر ایک سچے مسلمان کو امتحاناً جھیلنے پڑتے ہیں تو یقین جانو تمہارے دل غم سے بھر آتے۔ مگر میں ان اغراض کے لیے تمہارے پاس نہیں آئی ہوں بلکہ صرف ایک پیغامِ عمل لے کر آئی ہوں۔ اور یہ پیغام عمل نہ میری ذات سے وابستہ ہے اور نہ اسلام کے ان دو خادموں کی ذات سے جن کو خدا نے امانتاً میرے سپرد کیا اور جنھوں نے میری گود میں پرورش پائی۔ یہ سچ ہے کہ ایک ضعیف العمر ماں کا دل شوکت و محمد علی جیسے بچوں کی محبت سے لبریز ہونا چاہیے۔ میں بھی انسان ہوں اور میرا دل بھی جذبات محبت مادری سے ناآشنا نہیں--- میرے عزیزو! وہ رشتہ وہ تعلق، وہ قرابت ایک ایسا جادو ہے جو مجھے گوشہ عافیت سے نکال کر کلکتہ لے آیا اس جادو کا نام ''اسلام ہے اور وہ منتر لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔--- میں کلکتہ تک دنیا کی رسم ورواج کو بالائے طاق رکھ کر یہ بتانے آئی ہوں کہ ترکوں سے محبت کرنا کوئی جرم نہیں ہے کیا کُلُّ مُسْلِمٍ اِخْوۃٌ کے کوئی معنی نہیں ؟---اگر مسلمان کے نزدیک یہ ہمدردی بغاوت ہے تو صرف شوکت علی اور محمد علی ہی باغی نہیں، ہندوستان کے ۸ کروڑ مسلمان باغی ہیں--- اب سوال میرا تمہارا نہیں اسلام کا ہے۔ اس وقت تم کو تمہارے مذہب کو ایک سخت امتحان میں ڈالا گیا ہے۔ خدا تمہیں توفیق دے کہ تم اس سے کامیاب اور سرخرو نکلو--- میں اپنے ہندو بھائیوں کو یقین دلاتی ہوں کہ اگر کسی ہندوستان کے لیے ''ہوم رول'' کے جھنڈے کے نیچے ہم سب کو جمع کیا جائے تو ان شاء اللہ وہ اس ضعیفہ کو طالبان ہوم رول کی صفِ اول میں پائیں گے''۔۲۲

بی اماں کے شعلہ بیان، ولولہ انگریز خطاب کو گاندھی جی نے اسٹیج پر آکر سراہا اور روتے بلکتے انبوہ کثیر کو ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا:

''یہ رونے کا وقت نہیں ہے کام کرنے کا وقت ہے''۔۲۳

سروجنی دیوی نے کہا کہ ہندوستان کی نسوانی آواز کو اس کی اجازت دینا کہ وہ اٹھیں اور جو مطالبات مردوں کی طرف سے ہوئے ہیں ان کی تصدیق کریں، اس امر کا بین ثبوت ہے کہ ہم کامل اور ذمہ دارانہ سیلف گورنمنٹ کی قابلیت رکھتے ہیں۔ خواتین سابقہ روایات کے مطابق مردوں کو ان کی جدوجہد میں مدد کریں گی۔ خدا کرے کہ ہندوستانی مرد اس طرح کام کریں کہ وہ ہندوستانی خواتین کی امداد حاصل کر سکیں۔ ۲۴ اس مقام پر یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ بی اماں نے مردوں کو للکارا کہ وہ آگے کیوں نہیں آتے۔ ان کی خواتین کو آگے کیوں آنا پڑ رہا ہے۔ ایسے حالات میں انھوں نے کہا کہ برقع پوشوں کو زمانہ کی ضرورت کا خیال کرتے ہوئے میدان میں اترنا پڑے گا، اور یہ وقت کا تقاضہ ہے۔

۵۔ علی برادران اور دیگر افراد کی رہائی کے لیے ہفتہ نظر بندانِ اسلام منایا گیا۔ اس موقع پر بی اماں نے مسٹر تاج الدین کے نام پیامِ عمل بھیجا۔ یہ پیامِ عمل، حقوقِ نسواں اور فرائضِ نسواں کا خوبصورت گلدستہ ہے۔ اس میں فکر و عمل کی خوبصورت قوس قزح قائم ہے۔ بی اماں کا فکر و فلسفہ اس وقت مزید موثر ہو جاتا ہے، جب کہ داعی و پیامبر اس کی عملی تصویر ہو۔ اس طویل مراسلہ کا ذکر اس لیے بھی ضروری ہے کہ آج بھی امت مسلمہ کے ملی طرزِ عمل کے خدوخال کی نہ صرف یہ وضاحت کرتا ہے بلکہ عمل پیہم کی نصیحت بھی کرتا ہے۔

اس مراسلہ میں لکھا گیا کہ قومی و ملی کام کے لیے ہماری قوم انجمنیں قائم کی جاتی ہیں، پمفلٹ تقسیم کیے جاتے ہیں، چند سر برآوردہ شخصیات عہدوں پر براجمان ہو جاتی ہیں، اور سستی شہرت کے متوالوں کی بھیڑ جمع ہو جاتی ہے۔ فرماتی ہیں کہ قحط الرجال کے اس ماحول میں ذمہ دار شخصیات اگر اپنی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کریں گی تو خدا کے مواخدہ سے نہیں بچ سکتیں اور عامۃ الناس بھی ان پر اعتراض کر کے اپنے فرائض سے سبک دوش نہیں ہو سکتے۔ ۲۵

۶۔ ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیان والا باغ کے خونچکاں حادثہ نے عوام و خواص کے غیض و غضب کو آخری انتہاؤں تک پہنچا دیا تھا۔ خلافت تحریک اس وقت پورے ہندوستان کو علی برادران اور بی اماں کی قیادت میں فوجی سامراجیت سے بھرپور ٹکر لینے کے لیے تیار کرنے میں مصروف تھی۔ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کو اس سے کمک فراہم ہوئی۔ ہندو مسلم اتحاد کا قابلِ رشک منظر اس دوران ہماری تاریخ کا روشن ترین باب ہے۔ ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین تحریر کرتی ہیں کہ ترک موالات کی تجویز پہلے خلافت کانفرنس اور پھر کانگریس کے اجلاس میں منظور ہوئی۔ بی اماں باوجود پیرانہ سالی کے دل و جان سے شریک تحریک رہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے پنڈت سندر لال کے ایک انگریزی مضمون کے حوالے سے لکھا ہے:

> "۱۹۱۹ء تھا کہ مرادآباد میں صوبے کی پولیٹکل کانفرنس ڈاکٹر بھگوان داس کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ وہاں مہاتما گاندھی بھی موجود تھے۔ میں نے ترکِ موالات والا ریزولیوشن پیش کیا۔ سارے پُرانے لیڈروں نے مخالفت کی۔ تین دن گزر گئے اور ریزولیوشن پاس نہ ہو سکا۔ آخر میں مولانا شوکت علی آئے اور انھوں نے مہاتما گاندھی جی کی تجویز آزادی کی تائید کی۔ اس کے بعد مولانا کی والدہ بی اماں آئیں اور انھوں نے ریزولیوشن کی تائید کر دی۔ اس حیرت انگیز تقریر نے پانسہ پلٹ دیا۔ اور خود ڈاکٹر بھگوان داس نے مخالفت چھوڑ کر تائید کر دی اور ووٹنگ کے وقت کہا: جب خود بھارت ماتا، بی اماں کے روپ میں آگئی ہیں تو میں بھی تائید کرتا ہوں"۔ ۲۶

۷۔ تحریکِ خلافت کے سلسلے میں علی برادران ستمبر ۱۹۲۱ کو کراچی پہنچے۔ مولانا شوکت علی نے خلافت کانفرنس میں جو شیلی تقریر میں کہا کہ برطانوی فوج کی نوکری حرام ہے۔ اس کی پاداش میں انھیں دو سال کی قید کا حکم دیا گیا۔ بی اماں کہتی ہیں کہ ''میں نے شوکت و محمد کی سزا کی خبر سن کر دو رکعت نماز شکرانہ ادا کیا۔۔۔ مسلمان کی شان یہی ہے کہ وہ ہر حالت میں راضی بہ رضا رہے''۔ تحریکِ خلافت پر یہ الزام بھی لگایا گیا کہ گھر کی عورتیں بھی عطیات جمع کر رہی ہیں۔ جوں جوں حکومت کا رویہ سخت ہوتا گیا۔ معمر بی اماں کا لہجہ بھی شدت اختیار کرتا گیا وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش تیز تر کرنے لگیں۔ چنانچہ ۳۰ دسمبر ۱۹۲۱ء کو احمد آباد میں کل ہند زنانہ کانفرنس بی اماں کی صدارت میں منعقد کی گئی۔ جس میں ملک گیر سطح کی ہندو مسلم خواتین شریک ہوئیں۔ شریمتی کستوربا گاندھی جی، شریمتی سروجنی نائیڈو، شریمتی انوسیا بائی، شریمتی چودھرائن، شریمتی سرلادیوی، محمدی بیگم، شمس النساء بیگم، محترمہ بیگم ڈاکٹر انصاری، محترمہ نشاط النساء، بیگم حسرت موہانی، بیگم خواجہ، بیگم سیف الدین کچلو وغیرہ اس تاریخی اجتماع میں اپنے طویل خطبہ میں ایک جگہ بی ماں عرض گزار ہیں:

> پیاری بہنو! ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ ہم خدا کے ساتھ سچے رہیں اور اپنے عقیدوں پر مضبوط و استوار، وہ شخص جو خدا کے ساتھ وفادار نہ ہو کبھی گورنمنٹ کے ساتھ جسے انسان نے قائم کیا ہو، وفادار نہیں رہ سکتا۔۔۔ جس وقت تک ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور پارسیوں کا کامل اتحاد و اتفاق نہ ہو ہم ملک کو آزاد نہیں کرا سکتے۔ اور نہ پُرامن و باعزت زندگی بسر کر سکتے ہیں۔۔۔ ہماری قوم عیش پسندی اور کاہلی کی زندگی کی عادی ہوتی جارہی ہے۔۔۔ ہم نے یورپ کی اچھی عادتوں کے مقابلے میں بُری عادتیں سیکھی ہیں۔ لہٰذا خداوندی قانون مردوں اور عورتوں پر یکساں اثر ڈالتے ہیں۔ قومیں مردوں اور عورتوں پر مشتمل ہوتی ہیں اور جو فرائض مردوں پر عائد ہوتے ہیں ان سے عورتیں بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔ ہندوستان کی یہ بدنصیبی ہے کہ اس کی عورتیں عیش پسندی اور آرام طلبی کی زیادہ عادی ہو گئی ہیں۔ اور انھوں نے اپنے آپ کو کل حب الوطنی کے فرائض سے علیحدہ کر لیا ہے۔۔۔ پیاری بہنو! ہمارے درمیان میں سیتا اور حضرت زینبؓ کے نقوش پر چلنے والی خواتین موجود ہیں جن کے شوہر یا شہید کر دیئے گئے ہیں یا قید خانوں میں ڈال دیئے گئے ہیں۔ ہم ہندوستانی مرد و عورت کو خدا تعالیٰ کا سپاہی سمجھنا چاہیے۔ میں زور ڈال کر کہتی ہوں کہ پروردگار عالم کے علاوہ کسی سے نہ ڈرو لیکن اس کے ساتھ اپنے کو کسی وقتی مصلحت سے مرعوب بھی نہ ہونے دو۔۔۔ قید خانوں سے خوف نہ کھاؤ لیکن اس کے ساتھ اپنی مذہبی اور سوشل زندگی کی ذمہ داریوں کو بھی فراموش نہ کرو۔ میں تمہیں نصیحت کروں گی کہ جذبات کو مشتعل کرکے اپنی گرفتاری کا سبب نہ پیدا کرو لیکن اس کے ساتھ جب وہ پیش آئے تو اس سے بھاگو بھی نہیں۔ وہ تمہاری جرات اور بے خوفی کے ایک قدرتی نتیجہ کے طور پر وقوع پذیر آئے گی۔ تمہیں قرآن اور شاستر کے احکام کا پابند رہنا چاہیے۔ یاد رکھو جب کل مرد جیل خانوں میں چلے جائیں گے تو اس وقت آزادی کے پھریرے کو اڑتے ہوئے دیکھ لوگے۔ ۷[۲]

خلاصہ یہ کہ بی اماں زندگی کے آخری لمحات (۱۲، ۱۳ نومبر کی درمیانی شب ۱۹۲۴ء) تک قومی جدوجہد آزادی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو دینی ذمہ داری تصور کرتے ہوئے ہندوستان کے تمام باشندوں کے درمیان دعوت و تبلیغ کا کام نہایت حکمت و دانائی سے انجام دیا۔ ان کی دعوتی خدمات کا جائزہ الگ سے لینے کی ضرورت ہے۔ بی اماں پوری زندگی میں نوجوانوں، عورتوں اور بوڑھوں سے زیادہ متحرک

وفعال رہیں۔ اکثر اپنی بڑھاپے کی بیساکھی یا کسی قدآور لیڈر کے سہارے اسٹیج پر آتیں اور کرشماتی انداز میں پوری فضا کو آزادی ضمیر کا سبق پڑھا جاتیں۔

۴۔نواب سلطان جہاں بیگم (۱۹۳۰ء-۱۸۵۸ء)

علوم وفنون، رفاہی خدمات اور صحت عامہ کے لیے بھوپال کی نواب سلطان جہاں بیگم کی خدمات برصغیر کی مسلم تاریخ کا سنہرا باب ہے۔ نواب قدسیہ بیگم (۱۸۸۱ء-۱۸۰۱ء)، نواب سکندر بیگم (۱۸٦۸ء-۱۸۱۹ء)، نواب شاہ جہاں بیگم (۱۹۰۱ء-۱۸۳۸ء) اور نواب سلطان جہاں بیگم نے مسلسل ومتواتر ملکۂ برطانیہ کے ساتھ تعلقات استوار رکھے اور ہندوستان کی ثقافتی ودینی ترقی میں تاریخ ساز کردار ادا کرتی رہیں۔ ان خواتین نے مصالحتی نقطہ نظر کو ترجیح دی اور ٹکراؤ سے گریز کیا یہی وہ فکر وفلسفہ ہے جس پر سر سید احمد خاں (و:۱۸۹۸ء) پوری زندگی عامل رہے اور اپنی فکری واجتہادی کاوشوں کے طفیل مسلم مفکرین کی فہرست میں اپنا نام نقش کر گئے۔ سطور ذیل میں سلطان جہاں بیگم کی ملکی وقومی سطح کی تعلیمی ورفاہی خدمات کا مختصر خاکہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنی یادداشتوں کو اپنی تصنیف: ''حیات شاہجہانی''میں قلم بند کر دیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بچپن میں ان کی دینی ودنیاوی تعلیم وتربیت کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ ناظرہ قرآن اور اس کے ترجمہ کے لیے دو اساتذہ کا الگ الگ نظم کیا گیا تھا۔ اسی طرح خوش خطی، انگریزی، فارسی، حساب، گھڑسواری، تیغ زنی اور بعض دیگر عملی مشقوں کے لیے الگ الگ اساتذہ مقرر کیے گئے تھے۔ اس کتاب میں چوبیس گھنٹے کے نظام الاوقات کے چارٹ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بیگم صاحبہ کی شخصیت کے ارتقاء میں وقت کے بہتر استعمال کی کس قدر اہمیت ہے۔[۲۸]

نواب سلطان جہاں بیگم نے روایتی پردہ/برقع میں رہ کر کارجہاں آرائی کی۔ انھوں نے سلطنت کی نگرانی، مردوں سے مشاورت، رفاہی وتعلیمی اسکیموں کا معائینہ واحتساب الغرض دین ودنیاکے جملہ امور کو اسلامی روایات کی پابند رہ کر انجام دیا۔ پردے سے ان کی حد درجہ دلچسپی ہی کا نتیجہ ان کی معروف تصنیف ''عِفّت المسلمات'' ہے جو ۱۹۱۸ء میں ۲۰٦ صفحات کے اندر مفید عام اسٹیم پریس، آگرہ سے طبع ہوئی تھی۔ اس کتاب کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں قرآن وسنت کی بنیاد پر پردہ کا وجوب ثابت کیا گیا ہے۔ آثار صحابہ اور فقہاء امت کی آراء کو اس میں جمع کیا گیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ، مولانا بحر العلوم، مولانا شبلی نعمانی اور مولانا نذیر احمد دہلوی کی علمی بحثوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ کتاب کے خاص عنوانات یہ ہیں: ا۔عفت وحیا ہماری نیکیوں کی بنیاد ہیں، ۲۔عورت کی خانگی اور بیرونی معاشرت، ۳۔بے پردگی کے نتائج، ۴۔دنیائے اسلام میں بے پردگی، ۵۔مشرق اور مغرب کے گھر، ٦۔مخالفین پردہ کے دلائل اور ان کی تردید، ۷۔خاتمہ۔

تعلیمی اصلاحات وخدمات

نواب سلطان جہاں بیگم نے ریاست بھوپال کی رعایا (ہندو، مسلم، سکھ، زمیندار وعوام) کی نہ صرف جہالت وناخواندگی کو دور کیا بلکہ پورے خطے میں تعلیمی نظام کا جال بچھادیا۔ پردہ نشین خواتین کے لیے الگ مدرسوں کا الگ انتظام، اسی طرح لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے

الگ مدارس ان کی عطایا ہیں۔ انھوں نے دہلی میں ''لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج آف پردہ گارڈن'' کی سنگ بنیاد رکھی۔ دوسری طرف وقت کے تقاضوں کے تحت سرداروں اور جاگیرداروں کے بچوں کے لیے الگ اسکول قائم کیے۔ لیکن ایسا کرنے میں غریب عوام کی حق تلفی نہیں کی بلکہ اکثر حالات میں ان کی تعلیمی فیس معاف کی گئی اور کتاب نیز دیگر اسٹیشنری کے سامان مفت فراہم کیے گئے۔ قرآن وناظرہ نیز قرآنک اسٹڈیز کے لیے انھوں نے Sehore میں مسلم طلبہ کے لیے الگ نظم کیا۔ نواب صاحبہ نے مڈل اسکول اور کالج تک ان اسکولوں کو ترقی دینے میں اپنے اثرات ووسائل کا استعمال کیا۔ مثلاً ۱۹۰۶ء میں ہائی اسکول کو الہ آباد یونیورسٹی سے الحاق کرایا اور ارتھمیٹک کو اس کے نصاب میں خصوصی مقام دلایا۔ مشرقی لٹریچر کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی کا نصاب انھوں نے اپنے یہاں رائج کیا۔ ۲۹

انھوں نے ذہین، محنتی اور ضرورت مند طلبہ وطالبات کے لیے اسکالر شپ کا انتظام کیا۔ اس مد میں سالانہ دس ہزار روپیہ مختص کیا۔ یہ وظیفہ ان طلبہ کے لیے مخصوص تھا جو میڈیکل سائنس، انجینئرنگ، زراعت، قانون اور دیگر سائنسی علوم میں تعلیم کو جاری رکھنا چاہتے تھے۔ غیر معمولی ذہانت کے حامل طلبہ کو یورپ کی جامعات میں بھیجنے کا بندوبست تھا۔ ریاست کے تعلیمی نظام کا ایک قابل ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ کلاسز میں اخلاقیات کا لازمی کورس پڑھایا جاتا تھا تاکہ طلبہ وطالبات کی عام معلومات میں اضافہ کے ساتھ عام سماجی زندگی میں ادب وتہذیب کے اثرات پڑسکیں۔ انھوں نے ۱۹۰۰ء میں ''حمیدیہ لائبریری'' قائم کی تاکہ محققین اور عام طلبہ اپنی علمی پیاس بجھاسکیں۔ ایم اے او کالج علی گڑھ کے قیام سے یونیورسٹی بننے تک کا سفر نوابان بھوپال کی مالی سرپرستی سے عبارت ہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم کی مسلم نوازی، اور علم دوستی کے نتیجے میں انھیں آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کا صدر اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا پہلا چانسلر ۱۷دسمبر ۱۹۲۰ء کو مقرر کیا گیا۔ انھوں نے ایم اے او کالج کو یونیورسٹی کا مقام دلانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ان کی علم دوستی پر الگ سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

نواب سلطان جہاں بیگم کے نزدیک خواتین کی تعلیمی ضرورت کی تکمیل کے پیچھے یہ داعیہ کارفرما تھا کہ خاندانی نظام علم وآگہی کی روشنی میں رخت سفر طے کرسکے اور جہالت کا خاتمہ ہو۔ ان کا پختہ یقین تھا کہ ایک مسلم خاتون اپنے سماج کا نصف ہوتی ہے۔ اور زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کی خاطر اس نصف جہاں کو تعلیم یافتہ کرنا ضروری ہے۔ وہ کہتی تھیں کہ یہ احمقانہ بات ہے کہ لڑکیوں کو صرف لکھنا اور پڑھنا سکھا کر انھیں ان کی قسمت کے حوالہ کردیا جائے بلکہ انھیں ان کی صلاحیتوں کے مطابق پروان چڑھنے اور اپنے اعتماد کو بحال کرنے کا موقع فراہم ہونا چاہیے۔ انھوں نے خواتین کی تعلیم پر اپنی سلطنت کے خزانے کا ایک قابل لحاظ حصہ مختص کر رکھا تھا۔ اور درجات میں ناظرہ مع ترجمہ قرآن کے علاوہ اردو، ارتھمیٹک، جغرافیہ، امور خانہ داری اور معاشیات کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مثلاً ۱۹۱۲ء میں ایک لاکھ جب کہ ۱۹۱۷ء میں پانچ لاکھ اور ۱۹۱۸ء کے بعد یہ رقم او قاف کی شکل میں بڑھتی چلی گئی۔ انھوں نے بلقیس گرلس اسکول، سلیمانیہ اور جہانگیریہ اسکول کے علاوہ ہندو لڑکیوں کے لیے بھی الگ اسکول قائم کیے تاکہ انھیں شکایت نہ رہے اور ان کے مذہب کی تعلیم کا علیحدہ انتظام ممکن ہوسکے۔ جلسہ تقسیم انعامات منعقدہ ۱۶فروری ۱۹۱۱ء بمقام سلیمانیہ گرلس اسکول کے موقع پر ''تہذیب'' کی افادیت پر تقریر کرتے ہوئے فرماتی ہیں:

"تہذیب" دراصل تمدن کی بنیادی اینٹ ہے۔ اور تعلیم نسواں، تہذیب کی کنجی ہے۔ میری بچیو! تمہیں حصولِ تعلیم کے وافر مواقع عطا کیے گئے ہیں۔ مستعدی کے ساتھ تعلیم میں منہمک ہو جاؤ، تعلیم عورت کا خزانہ، اس کی تہذیب اور اس کا زیور ہے۔ لیکن یاد رہے کہ اخلاق کی بزرگی سے کبھی سمجھوتہ نہ کرنا۔ دنیاوی مفاخر تمہیں گھمنڈ میں مبتلا نہ کر دیں۔ --تم میری خاطر تعلیم نہیں حاصل کر رہی ہو بلکہ اس لیے کہ تمہیں لائق بیوی، اور قابل فخر ماں بننا ہے۔ گھر گرہستی اور بچوں کی تربیت دونوں عظیم انسانی ذمہ داریاں ہیں اور خدا نے ان دونوں کی خاطر عورت کی تخلیق کی ہے"۔ ۳۰

یہاں یہ ذکر بے جانہ ہوگا کہ تعلیم بیوگان اور پسماندگان کی خاطر پہلی بار ہندوستان میں اگر کسی نے قدم اٹھایا تو وہ نواب سلطان جہاں بیگم ہیں۔ اس مقصد کی خاطر انھوں نے ایک الگ اسکول قائم کیا۔ جہاں سوئی دھاگے کا ہنر، اور دیگر دستکاری کے کام انھیں سکھائے جاتے تھے تاکہ اپنے ہنر اور صلاحیت کی بنیاد پر وہ خود کفیل ہو سکیں۔ اسکول برائے بیوگان و پسماندگان کا سنگ بنیاد ان کے دوسرے بیٹے کرنل عبیداللہ خاں کے ہاتھوں ۲۳، مئی ۱۹۰۵ء کو رکھا گیا۔ سرکار عالیہ کے خزانے سے اس کے جملہ اخراجات کا انتظام کیا جاتا تھا۔ بعد میں تین اور بڑے اسکول کو اس سے ملحق کر دیا گیا تاکہ ہندو، جین، سکھ اور دیگر اقوام کی عورتیں بھی اس مہم میں شریک کی جا سکیں۔ ۳۱

تعلیم کے حوالہ سے یہ تذکرہ بھی ضروری ہے کہ نواب صاحبہ کی کوششوں سے ۱۹۱۱ء میں کنڈرگارٹن (K.G) کلاسیز کا آغاز کیا گیا۔ ان بچوں کی تعلیمی تربیت اور ان کی کلاسیز کا انعقاد علی منزل، بھوپال میں کیا جاتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ تعلیم نسواں کا انتظام صوبہ بھوپال میں بہت ہی منظّم انداز اور وسیع پیمانے پر کیا گیا۔

صحت عامہ

اپنے پیش روفرمارِوائے بھوپال کی مانند، نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنی ریاست کی عوام کی صحت و تندرستی اور انھیں وباؤں سے محفوظ رکھنے کی خاطر مرد و خواتین کے لیے دو الگ الگ ہاسپٹل تعمیر کیے۔ مردوں کے لیے پرنس آف ویلس ہاسپٹیل جب کہ خواتین کے لیے لیڈی لینڈرون ہاسپیٹل قائم کیے۔ اسی طرح ۱۹۱۲ء میں لیڈی ہارڈنگ کی آمد کے موقع پر انفینٹ ہوم اور لیڈی منٹو نرسنگ اسکول کا افتتاح کیا گیا۔ ایک دوسرے موقع پر نرسنگ اسکول کی ضرورت کا ان الفاظ میں ہدیہ تشکر پیش کرتی ہیں:

اشد ضرورت کے وقت ڈاکٹر کی ضرورت پیش آتی ہے اور عام آدمی اپنے خرچ سے بیماریوں پر قابو نہیں پا پاتا۔ ہمارے ملک میں نرسنگ کے آرٹ کی کمی ہے۔ یورپ میں خواتین نرسنگ کے فن کی تربیت لے کر ہاسپیٹل اور پرائیویٹ طور پر یا اپنے گھروں سے صحت کی دیکھ ریکھ کرتی ہیں، چنانچہ ہمارے ملک میں بھی ضرورت ہے کہ خواتین کو یہ ہنر سکھایا جائے اور یہی وہ ضرورت ہے جس کے پیش نظر بھوپال میں نرسنگ اسکول کا سنگ بنیاد ہز ایکسلینسی لیڈی منٹو کی موجودگی میں رکھا جارہا ہے، لیڈی منٹو نے ہندوستان میں نرسنگ کے مشن کی خاطر بہت عظیم خدمت انجام دی ہے اور سہولتیں فراہم کی ہیں۔ ان کی اجازت سے ان کے نام سے اسے معنون کیا جاتا ہے۔ اور میں اس کا نام لیڈی نرسنگ اسکول رکھتی ہوں"۔ ۳۲

زچہ بچہ کی صحت اور ان کی زندگیوں کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے نواب صاحبہ نے مختلف عملی اقدامات کیے۔ پوری ریاست کی دایوں کو تربیت دینے کے لیے انھوں نے لیڈی لینڈون ہاسپیٹل میں ان کی حاضری کو لازمی قرار دیا تاکہ لیڈی ڈاکٹر سے وہ اس فن میں مہارت

سیکھیں۔ان دایوں کو کہا گیا کہ وہ اپنی بچیوں کو بھی تربیت کی خاطر یہاں لائیں تاکہ وراثت کا یہ پیشہ عملی تربیت کے ساتھ جاری رہے۔ یہاں سے ٹریننگ کی ایک سرٹیفکیٹ عطا کی جاتی تھی اور نواب صاحبہ نے پوری ریاست میں حکم صادر کر دیا تھا کہ صرف وہی خواتین دایہ گیری کر سکتی ہیں جن کے پاس کوئی سرٹیفکیٹ ہوگی۔اور ایسی خواتین کو حوصلہ افزائی کی خاطر پانچ روپے ماہانہ الاؤنس بھی دیا جاتا تھا۔انھوں نے یہ اعلان بھی جاری کیا کہ ریاست کے کسی حصے میں اگر تحفظ صحت کے لیے تربیت یافتہ دایوں کے رکھنے کا انتظام نہیں ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صرف نصف آبادی کے مفادات کا خیال رکھتا ہے، اور اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ خواتین کی ضرورت کے احساس اور خیال سے عاری ہے۔انھوں نے اس شعبے کو مزید منظّم اور فعال کرنے کے لیے بعض نگراں خاتون ڈاکٹر کا تقرر بھی کیا۔ مزید برآں شعبہ حفظان صحت عامہ کی جانب سے چیچک کی بیماری پر قابو اور اسے معتدل بنانے کی ریاست گیر مہم چلائی گئی۔مثلاً کسی ایک بچے کو ٹیکہ لگوانے کے عوض میں بیگم سلطان جہاں صاحبہ نے چار آنہ (پچیس پیسے) کا انعام بھی رکھا تھا۔اسی طرح ڈسپنسریوں کو مختلف مفصل اور تحصیلوں میں قائم کیا گیا تاکہ روز مرہ کی دوائیں دی جا سکیں۔آفیسر برائے صفائی ستھرائی کا تقرر کیا گیا اور جنوبی و مشرقی اضلاع میں دو نئے ہاسپٹل بھی قائم کیے گئے۔

نواب سلطان جہاں بیگم کی تصنیف ''حیات شاہجہانی'' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فرماں روائے بھوپال کی حیثیت سے ۱۹۰۱ء - ۱۹۲۶ء کے دوران انھوں نے تعلیم و صحت کے علاوہ زندگی کے جملہ شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔انھوں نے گزشتہ دور کے فرسودہ قوانین کی جگہ جدید اور مستحکم قوانین وضع کیے۔مثلاً شعبہ عدلیہ میں ہائی کورٹ اور ضلعی سطحوں کے عدالتی نظام کو استحکام بخشا۔شعبہ پولیس اور جیل کے لیے قواعد بنائے، ریاست میں صنعتوں کے فروغ کے لیے قانون سازی کی اور خام مال کو قابل استعمال بنانے کے لیے فیکٹریوں کے سلسلے قائم کیے۔ ۳۳

الغرض بیگم سلطان جہاں بیگم نے اسلام کے عطا کردہ حقوق سے بھرپور استفادہ کیا اور اسلامی شعار کو اختیار کرتے ہوئے اپنی سیاسی و سماجی ذمہ داریوں کو اس طرح ادا کیا کہ اس میدان میں وہ نہ صرف اپنے زمانے میں بلکہ بعد کے ادوار میں بھی بڑے بڑے مدبر مردوں پر سبقت لے گئیں۔ان کے کردار میں اسلام کے عطا کردہ حقوق و اختیارات کا خوبصورت سنگم موجود ہے۔

حاصل بحث اور چند تجاویز:

سطور بالا میں لکھنؤ، رامپور اور بھوپال کی چار قومی و بین الاقوامی شہرت یافتہ مسلم خواتین کی سماجی، سیاسی، رفاہی اور تعلیمی و طبّی خدمات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔اس مطالعہ کے ذریعہ درج ذیل پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے:

۱۔ دین و شریعت اور ملک و ملت کے تحفظ کی پاسبانی کی فکر تمام خواتین کی ترجیح رہی ہے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی اول ۱۸۵۷ء سے ان خواتین کی سیاسی بصیرتوں کا آغاز ہوتا ہے۔ بیگم حضرت محل کی عیسائیوں سے سخت دشمنی، ان کا آخری عمر نیپال میں جلاوطن کی زندگی گزارنا، دراصل اسلام کی عطا کردہ تعلیمات کا ہی نتیجہ ہے جس نے آزادی ضمیر کے لیے قربان ہونے کا درس دیا ہے اور ضمیر فروشی سے ہمیشہ دور رکھا۔خواتین کی خدمات کا یہ پہلو آج بھی ایمان میں تازگی اور جوش پیدا کرتا ہے کہ ہندوستان کی ان بیٹیوں

نے زندگی بھر ظلم کے خلاف حق کا علم بلند کیا۔ قید وبند کی دھمکی اور جلاوطن کی زندگی ان کے جذبہ ایمانی کا سودہ نہ کر سکی۔ حضرت بیگم محل اور بی اماں کا کردار اس ضمن میں لائق تحسین ہے۔

۲۔ تمام خواتین نے اسلام کے عطا کردہ حقوق کا پاس ولحاظ رکھا۔ بھرپور خاندانی زندگی گزاری، اپنے بچوں کی اعلیٰ تعلیم وتربیت کا انتظام کیا۔ تجرد کی زندگی کسی نے اختیار نہیں کی۔ روایتی پردے کا اکثر نے پوری زندگی اہتمام کیا۔ بعضوں نے چہرے کے پردے کی رعایت نہیں کی جس کی بہر حال شریعت میں اجازت ہے۔ چناچہ سید سلیمان ندوی نے نشاط النساء بیگم کی بابت ذکر کیا ہے کہ حسرت کے مقدمہ کی پیروی کے دوران وہ چہرہ کھول کر نہایت سادہ لیکن پردہ پوش لباس میں باہر آتیں اور کسی کی پرواہ نہ کرتیں۔[۴۳] قابل ذکر بات یہ ہے کہ سلطان جہاں بیگم نے تو"عفت المسلمات" نامی کتاب ہی مسئلہ پردہ پر تحریر کرکے اپنی اسلامی حمیت کا اظہار کیا۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی میں ملک وبیرون کے دوروں اور اجتماعات میں اسلامی حجاب کا اہتمام کیا۔ ان خواتین نے اسلامی حقوق کی بحالی کے لیے غیر ضروری تجدد پسندی کے مقابلہ میں قرآن وسنت سے رہنمائی حاصل کی۔ چنانچہ تعلیم وتربیت، رفاہی امور اور خدمت خلق کے شعبوں میں ان کی فتوحات اسی اسلامی نقطہ نظر کا ثمرہ ہے۔

۳۔ ان خواتین نے پورے ہندوستان کی خواتین کا تزکیہ کیا، انھیں اسلام کی خاطر متحد ہو کر مردوں کا تعاون کرنا سکھایا۔ آزادی ضمیر کے لیے جدوجہد کو ان کی ذمہ داری بتائی اور اسے خدا کی نگاہ میں مسئولیت کے مسئلے سے جوڑ دیا۔ ان خواتین نے ملکی سطح کی خواتین کی انجمنیں بنائیں اور ان کی صدارت بھی کی۔ اور ثابت کردیا کہ عورت اپنے فطری دائرے میں رہ کر بہت کچھ کر سکتی ہے۔

۴۔ تعلیم نسواں اور صحتِ نسواں کے لیے متعدد خواتین نے ریاستی سطح کی مہم چلائی۔ ان کوششوں سے خواتین کے اندر بطور خاص خواندگی کی سطح کافی بلند ہوئی۔ مثلاً ۱۸۷۲ء میں سکندر بیگم کی کوششوں کے نتیجہ میں بھوپال میں ۱۳ء۱۲ فی صد آبادی خواندہ ہو گئی۔ دیگر بھوپالی نواب خواتین کی تعلیمی کوششوں کے نتیجے میں مسلم وہندو بچیوں کے لیے الگ الگ اسکولوں کے انتظامات کیے گئے۔ بیگم سلطان جہاں کا کردار اس ضمن میں نہایت واضح اور چشم کشا ہے۔ خواتین کی صحت کے لیے دایہ گیری کی تعلیم کا چاق وچوبند نظم کرنا، چیچک اور دیگر وبائی امراض کی روک تھام کے لیے ڈسپنسری، اسپتال، ڈاکٹرز اور نرسوں کا بندوبست کرنا دراصل ان خواتین نے اسی جذبے کے تحت کیا جو اسلام نے ذمہ داری کی صورت میں عام مرد وخاتون اور خلیفہ وحاکم پر فرض وواجب قرار دیا ہے۔

۵۔ خواتین کی سیاسی اور تعلیمی خدمات کے نہ صرف واضح اثرات ہندوستانی تاریخ میں محسوس کیے گئے بلکہ متعدد مستشرقین اور غیر متعصب مسلم وعلم دوست مؤرخین نے ان کی ستائش کی ہے۔ مثلاً سر ڈبلیو ایچ رسل نے حضرت محل کی تعریف کی جب کہ بی اماں کی توصیف شردھانند سرسوتی اور ملک کے تمام بڑے بڑے قومی لیڈروں نے نے مجمع عام میں کی۔ مسلم خواتین کے تئیں اہل علم وسیاست کی جانب سے اعتراف، پر الگ سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ اعتراف گنگا جمنی تہذیب کو مستحکم کرے گا۔

۶۔ بعض خواتین مثلاً بی اماں نے جنگ آزادی کو اسلامی نقطہ نظر سے دیکھا، ترکی مسلمانوں سے محبت کو اسلام اور عقیدہ سے اٹوٹ محبت کا حصہ قرار دیا۔ اور ملک وقوم سے محبت اور دین وعقیدہ سے محبت کو پان اسلامزم کی جامع تعریف قرار دیا۔ انھوں نے خلافت تحریک کے اوپر سے اغیار کی طرف سے لگائے گئے الزامات کی قلعی کھول کر رکھ دی اور واضح کر دیا کہ خلافت تحریک کا مقصد

ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام نہیں بلکہ اسلامی عالمی اخوت کا مظاہرہ ہے۔ بی اماں کی کوششوں نے مسلم لیگ اور کانگریس کو مقام بلند عطا کیا۔ ہندو مسلم اتحاد و یکجہتی اور ملک و ملت کے وقار کی بحالی کی خاطر آبادی بیگم نے اپنے دو عبقری بہادر اسلام پسند بیٹوں کو قربان کردیا۔ اور ان بچوں کی ماں ہونے کے ساتھ پورے ہندوستان کی بی اماں کہلائیں۔ گاندھی جی کو عوامی مقبولیت دلانے میں بھی بی اماں کا کردار ان کی اعلیٰ ظرفی، بلند نگہی اور اسلامی رواداری کی عظیم مثال ہے۔ تمام قومی انجمنوں اور تحریکات: ہندو مسلم نے خود بی اماں کی زندگی ہی میں ان کی عظمتوں کا اعتراف کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی کی تاریخ بی اماں کی قربانیوں کے بغیر ادھوری ہے۔

۷۔ بھوپال کی خواتین کو حکومت برطانیہ کے قانون وراثت، ۱۸۶۵ء کی رو سے از خود سیاسی حکمرانی کے مواقع ملتے چلے گئے۔ شاید خالق کائنات کو مسلم خواتین کی سیاسی بصیرت اور رفاہی خدمات سے جوڑ کر گزشتہ صدیوں میں وہ عظیم کام لینا تھا جو اُن ہنگامی حالات میں مردوں کے بس میں بھی نہیں تھا۔ ان خواتین نے مسند سیاست کے لیے کوئی جوڑ توڑ نہیں کی۔ بلکہ ملکہ برطانیہ کے ساتھ مصالحتی پالیسی پر عمل پیرا ہو گئیں۔ یہ وہی کردار ہے جو ان سے پیشتر سر سید احمد خاںؒ نے اختیار کیا تھا۔ ان خواتین نے پسماندہ، ذلیل اور جاہل مسلم قوم کو علم و حکمت کا ہتھیار عطا کرنے میں سبقت حاصل کی۔ بھوپال کی خواتین کی علم دوستی اور ہندو مسلم اتحاد کی اس کاوش کو اسی پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ مقالہ مردوں کو دعوت غور و فکر دیتا ہے کہ خواتین کی خدمات کا بھی کھلے بندوں اعتراف ہونا چاہیے اور قوامیت اور ناقصات عقل و دین کا صحیح تناظر پیش کرنا چاہیے۔ ابو عبدالرحمٰن عبدالحلیم ابوشقہ نے اس حدیث اور قرآنی آیت کا خوبصورت بیانیہ پیش کیا ہے۔

۸۔ بی اماں نے ثابت کردیا کہ ایک عورت گھر پر رہ کر عالمہ و مدبرہ بن سکتی ہے۔ جب کہ سلطان جہاں بیگم نے عملاً دکھادیا کہ پردہ باعث ننگ و عار نہیں بلکہ وہ علامتِ حیا ہے اور برقع پہن کر زندگی کے تمام اقدامی امور انجام دیئے جاسکتے ہیں۔ گویا گزشتہ صدیوں میں ایک طرف خواتین، مردوں کے شانہ بشانہ سیاسی، سماجی اور رفاہی خدمات انجام دیتی رہیں۔ دوسری جانب بعض خواتین کھدّر کا لباس پہن کر سودیشی تحریک کو جلا بخشتی رہیں اور تیسری طرف امت مسلمہ کی اقلیت کو اکثریت کے ساتھ حسن تعامل کا سبق بھی سکھاتی رہیں اور تکثیری معاشرے میں اقلیت و اکثریت کے مابین بقائے باہم کے اسباق بھی پڑھاتی رہیں۔

۹۔ ضرورت ہے کہ تحریک عدم تعاون، تحریک کانگریس، تحریک مسلم لیگ اور تحریک خلافت سے وابستہ قومی سطح کی معروف مسلم خواتین کی خدمات کا اسلامی پس منظر تلاش کیا جائے۔ اس مطالعہ کے ذریعہ غیر مسلم خواتین کے ساتھ مل کر کام کرنے والی خواتین، مکمل ہندوستان کو آزاد کرانے والی خواتین، ہریجنوں کے دکھ درد کو محسوس کرنے والی خواتین اپنے بچوں اور شوہروں کو جیل بھیج کر شکرانہ ادا کرنے والی خواتین، مردوں کے کاز کو تقویت پہنچانے والی خواتین، تعلیم نسواں نیز صحت نسواں کی مہمات سر کرنے والی خواتین کا خوبصورت تاریخی گلدستہ تیار ہوسکے گا، جو عین اسلامی تعلیمات اور اسلامی حقوق کی دانش مندانہ تعبیر کی وضاحت کرے گا۔

۱۰۔ ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ مذکورہ خواتین کی علماء نوازی، مدارس، جامعات اور مساجد کی تعمیر و ترقی، اسلامی علوم کی سرپرستی اور عظیم کتب خانوں کے قیام و انصرام نیز دارالمعارف کی تزئین و آرائش اور دائرۃ المعارف کی تصنیف و تالیف میں ان کے گرانقدر عطیات پر الگ سے کام کیا جائے۔ بطور مثال نواب بھوپال کی قائم کردہ مجلس شوریٰ کا نام نظارۃ المعارف تھا۔ مولانا شبلی نے

نواب صاحبہ کی خواہش پر بھوپال کے مدارس کی اصلاح و تنظیم کا خاکہ تیار کیا جسے سید سلیمان ندوی ہندوستانی مدارس کی اصلاح کا پہلا نقشہ قرار دیتے ہیں۔ اس نصاب میں نحو وصرف، انشاء وادب، تاریخ، حدیث، فقہ وعقائد ومنطق کے علاوہ مدرستہ العلوم، علی گڑھ میں رائج نصاب سے بھی فائدہ اٹھایا گیا تھا۔ سرکار بھوپال کی پہلی سالانہ رپورٹ بابت ۱۹۰۰ء میں اس ترمیم واصلاح کی ستائش کی گئی ہے۔ ۳۵ اسی طرح روایتی دینداری سے ربط و تعلق اور عصری تقاضوں کی بجاآوری میں اسلام کی روشن، متحرک اور عملی تعلیمات کا جائزہ لے کر معترضین کے الزامات کی تردید کی ضرورت ہے۔ جو عورت کے گھر سے باہر قدم نکالنے کو غیر اسلامی قرار دیتے ہیں اور حجاب کے مسئلے پر خواہ مخواہ واویلا مچاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ چاروں خواتین منکرات سے مجتنب رہیں۔ اور معروفات کو فروغ دیتی رہیں۔ بلا شبہ ہندوستانی تاریخ میں ان خواتین کے نام سنہرے حروف میں لکھے جانے کے مستحق ہیں:

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے　　　وہ قرض اتارا ہے جو واجب بھی نہیں تھے

حواشی، حوالہ جات وتعلیقات

۱۔ خواتین کی دینی، سماجی، اور معاشی شراکت داری کے موضوع پر تحقیقی بحث کے لیے رجوع کریں: ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی، رسول اکرم ﷺ اور خواتین-ایک سماجی مطالعہ، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی ۲۰۰۶ء نیز دیکھیں، شیخ ابوعبدالرحمن عبدالحلیم محمد ابوشقہ، خواتین کی آزادی، عہد رسالت میں، المعہد العالمی للفکر الاسلامی (IIIT) پوسٹ بکس نمبر ۶۶۹، ہرنڈن، ورجینیا، ۲۲۰۷۰، امریکہ، غیر مؤرخہ۔ مزید دیکھیں: مقالہ راقم، نبوی معاشرت میں خواتین کی حصہ داری (سدالذریعہ کے شرعی اصول کا نفاذ) Empowerment of Women Under the Prophet of Islam, Seerat Committee, AMU, Aligarh, 2015, pp 648-666

۲۔ مولانا سید جلال الدین عمری (پ: ۱۹۳۵ء) نے نسائیات پر قرآن وسنت کی روشنی میں تحقیقی کتابیں تحریر کی ہیں۔ مثلاً عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ۔ ۲- عورت اور اسلام، ۳- مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں عصر حاضر میں۔ تحریک آزادی نسواں کے نتیجے میں بے لگام آزادی کا جائزہ اور شریعت مطہرہ کی فطری آزادی کی برکات سے خواتین کی عفت وعصمت کے تحفظ نیز اسلام کے خاندانی نظام کی معقولیت پر موصوف کی کتابیں بطور خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

۳۔ اسلام سے قبل یہودی گھرانے اور تہذیب میں محترمہ مریم جمیلہ کی پرورش ہوئی۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریروں کے نتیجے میں حلقہ بگوش اسلام ہوئیں۔ Islam in Theory and Practice نامی اپنی چشم کشا کتاب کے ذریعہ مغربی دنیا میں وہ اسلام کی انقلابی رہنما اور ترجمان کی حیثیت سے معروف ہو گئیں۔ ان کی دیگر کتابیں یہ ہیں: 2. Islam Versus the West, 3. Islam and the Muslim Woman Today 4. Who is Maududi?

۴۔ اس موضوع پر ایک اہم تحقیقی کام ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین نے کیا ہے۔ معروف مؤرخ پروفیسر ایمریٹس عرفان حبیب نے اس کی صحت اور معروضیت کی تحسین کی ہے۔ دیکھیں: ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ، ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ، ۱۹۹۰ء، کل صفحات: ۳۲۵، مزید دیکھیں: Gouri Srivastava, The Legend Makers: Some Eminent Muslim Women of India, Concept Publishing Company, New Delhi, 2003,pp135، محترمہ ڈاکٹر فرحین طاہر نے راقم کے اشراف میں ۲۰۱۷ء میں اپنی پی ایچ ڈی، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جمع کی تھی۔ انھیں جس موضوع پر ڈگری ایوارڈ ہوئی اس کا عنوان تھا: Socio-Political Role of Women in Islam (18th to 20th Centuries)

۵۔ نواب سکندر بیگم کے سوانحی خاکہ کے لیے رجوع کریں: Gouri Srivastava, The Legend Makers: Some Eminent Muslim Women of India محولہ بالا، ص ص ۴۳، ۴۴، ۴۶

۶۔ Gouri Srivastawa، محولہ بالا، ص ص ۴۵-۴۶

۷۔ Nawab Sultan Jahan Begam, An Account of My Life: Gohur-i-Iqbal Vol.1, Translated by C.H. Payne, London, Murray, 1912, vol.11, Translated by Abdus Samad Khan, Bombay, 1922, cf. Gouri Srivastava, Ibid, 49

۸۔ Gouri Srivastawa، محولہ بالا، ص ص ۴۸-۴۹

۹۔ بیگم حضرت محل کی ابتدائی تاریخ پر بہت کم مواد ملتا ہے۔ یہ واجد علی شاہ کی دوسری بیوی تھیں۔ کچھ مواد ویکی پیڈیا پر اپلوڈ ہے۔ تاہم بعض اہم دستاویزی معلومات کے لیے رجوع کریں: امداد صابری، سیاسی رہنماؤں کی مائیں و بیویاں، جمال پریس، دہلی ۶، ۱۹۸۶ء، امرت لال ناگر، غدر کے پھول، ایک ڈائری (ہندی) پرکاش شاکھا سوچنا و بھاگ، اترپردیش، ۱۹۵۷ء انتظام اللہ شہابی، بیگمات اودھ کے خطوط، مکتبہ ادب اردو بازار، دہلی، ۱۹۵۷ء، انیس فاطمہ بریلوی، ۱۸۵۷ء کے ہیرو، مسلم یونیورسٹی پریس، ۱۹۴۹ء پنڈت سندر لال، سن ستاون (اردو)، انجمن ترقی اردو، ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء، خورشید مصطفی رضوی، جنگ آزادی اٹھارہ سو ستاون، مکتبہ برہان، اردو بازار، دہلی، ۱۹۵۹ء، شمس العلماء ذکاء اللہ، تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند، شمس المطابع، دہلی، ۱۹۰۴ء

۱۰۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ، ڈاکٹر عابدہ سمیع اللہ، ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ، ۱۹۹۰ء، ص ص ۲۴-۲۵

۱۱۔ خلیق احمد نظامی، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، باب سوم، علی گڑھ، ۱۹۵۰ء، نیز دیکھیں مولانا مسعود عالم ندوی، ہندوستان کی پہلی اسلامی حکومت، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۸۱ء،

۱۲۔ شمس العلماء، مولوی ذکاء اللہ، تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند، شمس المطابع، دہلی، ۱۹۰۴ء، ص ۸۶۲

۱۳۔ ڈاکٹر عابدہ سمیع اللہ، ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ، محولہ بالا، ص ۲۳

۱۴۔ ڈاکٹر عابدہ سمیع اللہ، ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ، محولہ بالا، ص ۳۴

۱۵۔ Foreign Political Consultations 17th Dec. 1858, Nos 250/54, National Archives, New Delhi، نیز دیکھیں، مخلصاً بحوالہ ڈاکٹر عابدہ سمیع اللہ، ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ، ص ص ۳۷۔۴۰

۱۶۔ رسل کی ڈائری، ص ۲۷۵، بحوالہ پنڈت سندر لال، سن ستاون (اردو) انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء

۱۷۔ بی اماں کی حیات و خدمات کے لیے دیکھیں: امداد صابری، سیاسی رہنماؤں کی مائیں، بیویاں، جمال پریس، دہلی ۱۹۸۶ء، خلیل احمد منگوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، کتب خانہ عزیزیہ دہلی، ۱۹۴۵ء۔ Kabir Kausar & Inam Kabir, Bibliographical Dictionary of Prominent Muslim Ladies, Life and Light Publisher, New Delhi, 1982۔ نیز دیکھیں اوراقِ گم گشتہ، ترتیب و تہذیب، سید رئیس احمد جعفری ندوی، محمد علی اکیڈمی، لاہور

۱۸۔ پورے متن کا مطالعہ کرنے کے لیے رجوع کریں، مدینہ اخبار، بجنور، ۵؍ اکتوبر ۱۹۱۷ء، کی فائل

۱۹۔ ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین، ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ، محولہ بالا، ص ۶۷

۲۰۔ پورے خط کا متن دیکھیں، چند اہم خطوط، صدر دفتر انجمن اعانت نظر بندان اسلام، دہلی، ۱۹۱۸ء، بحوالہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ، محولہ بالا، ص ص ۶۸۔۸۲

۲۱۔ اخبار جمہور، کلکتہ، ۸؍ جنوری ۱۹۱۸ء، بحوالہ ہندوستان کی جنگ آزادی، محولہ بالا، ص ص ۸۷۔۸۸

۲۲۔ ہندوستان کی آزادی کے لیے ۱۹۱۶۔۱۹۱۸ء کے درمیان انڈین ہوم رول تحریک چلائی گئی اس تحریک کے بانیوں میں Annie Besant اور بال گنگادھر تلک پیش پیش تھے۔ ۱۹۲۱ء میں ہوم رول کا نام "سوراج سبھا" سے تبدیل کر دیا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ عہد برطانیہ میں دستوری طریقہ کو اپناتے ہوئے کاؤنسل کی حکومت قائم کی جائے اور اس کے ممبروں کا انتخاب اہل ہندوستان کریں۔ بال گنگادھر تلک کی گرفتاری کی وجہ سے یہ تحریک ناکام ہو گئی۔ مزید دیکھیں: Indian Home Rule, M.K. Gandhi, The International Printing Press, Phenix, Natal, 1910

۲۳۔ اخبار جمہور، کلکتہ، ۱۲؍ جنوری ۱۹۱۸ء، بحوالہ ہندوستان کی جنگ آزادی، ص ۹۴

۲۴۔ اخبار جمہور، کلکتہ، ۱۰؍ جنوری ۱۹۱۸ء، بحوالہ ہندوستان کی جنگ آزادی، ص ۹۵

۲۵۔ اخبار جمہور، کلکتہ، ۱۰؍ جولائی ۱۹۱۸ء،

۲۶۔ صدق جدید، لکھنؤ، ۲۶؍ جنوری ۱۹۴۹ء، ص ا و ۲، بحوالہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں خواتین کا حصہ، محولہ بالا، ص ص ۹۸۔۹۹

۲۷۔ اوراق گم گشتہ، محولہ بالا، ص ص ۱۸۳۔۱۸۵، بحوالہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں عورت کا حصہ، ص ص ۱۰۰۔۱۰۳

۲۸۔ Hayat-e-Shahjahani: Life of Her Highness: The Late Nawab Shahjahan Begum, Translated by B.Ghosal, Bombay, 1926

۲۹۔ Mittal, Kamla, History of Bhopal State: Development of Constitution, Administration and National Awakening, 1901-1949, Munshiram Manoharlal Publishers, PVT LTD. New Delhi, 1990

۳۰۔ Sultan Jahan Begum, An Account of my Life محولہ بالا، ص ۷۲

۳۱۔ Mittal Kamla بحوالہ Gauri Srivastav، ص ۷۴

۳۲۔ نواب سلطان جہاں بیگم، حیات شاہ جہانی، جلد سوم، ص ص ۲۱-۲۳، بحوالہ Gouri Srivastava، ص ص ۷۴-۷۵

۳۳۔ نواب سلطان جہاں بیگم کی خدمات کے لیے یکھیں: Gauri Srivastava، ص ص ۷۶-۸۲

۳۴۔ سید سلیمان، نگار لکھنؤ، حسرت نمبر، جنوری-فروری ۱۹۵۲ء، ص ۱۱۸

۳۵۔ سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۱۹۹۹ء، ص ص ۳۲۵، ۳۲۴-۳۳۰